Jinnah Cap Factory
NIZAM SHAHI ROAD HYD
جناح
کیاپ فیکٹری
نظام شاہی روڈ
حیدرآباد دکن

جنوبی ہند کا کثیرالاشاعت ادبی ماہنامہ

ایڈیٹر: سید مختار محمد کرمانی
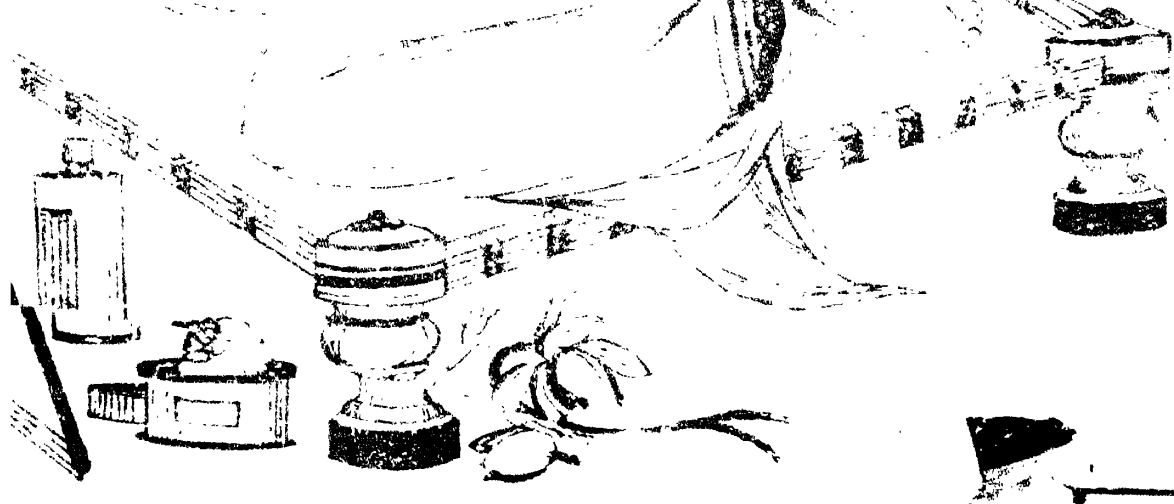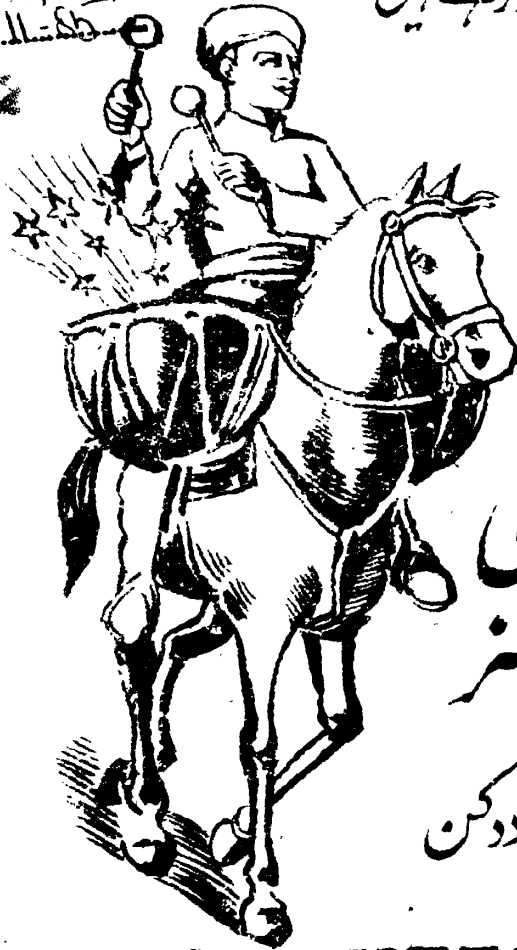
دکن میں بوٹے گل پھیلی ہے
بوٹی روغن

STAR CONFECTIONERY

ESA MIA BAZAR HYDERABAD (DN.)

PROP. MD. ZIKRIAH

عظیم تر حیدرآباد کی عظیم الشان مصنوعات

روح تازہ کمپنی نے

عطر جناح

پیکٹ کلاں عہ
پیکٹ خورد عہ

وجناح سینٹ

پیکٹ کلاں عہ
پیکٹ خورد عہ

بناکر دکن کی اعلیٰ ترین مصنوعات میں
اضافہ کردیا ہے۔ عطر جناح وجناح سینٹ
نہ صرف دکن میں عام مقبولیت حاصل
ہوئی ہے بلکہ بیرون ملک بھی قدر کی نگاہ ہو
دیکھ رہا ہے عطر جناح وجناح سینٹ اپنی اعلیٰ ترین خوشبو سے حافظ
انتہائی لطیف و دیرپا ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ روح تازہ کمپنی کی بیس سال سے نہایت
کامیابی کیساتھ ہزاروں گھروں میں استعمال کیجانے والی مصنوعات کا استعمال پیسے کی بچت اور صحت کی حفاظت
کا بہترین ذریعہ قرار پائی ہیں

اصلی روغن آملہ براق مارکہ نیرنگ بہار ہیر آئیل
نورتن قوت دماغ، قوام، روح افزا برقی زردہ

حاجی محمد عبدالرزاق مینار اینڈ سنس جنرل مرچنٹس گلبرگہ شریف
اسٹاکسٹ:۔ نظام اسٹور اورنگ آباد۔ محمد عبدالرحیم
محمد یعقوب رائچور۔ سید یوسف علی کنوٹ ضلع عادل آباد
معین الدین اینڈ برادرس نظام آباد

برقی زردہ
فی ڈبیہ ۱۵ ، ۸ ،

نوٹ:۔ ہندوستان کے ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے

شیشہ کلاں عہ ۸ ، درمیانہ عہ

روح تازہ کمپنی
چمن گولیگوڑہ
حیدرآباد دکن
شاخ مچھلی کمان

Jinnah Cap Factory
NIZAM SHAHI ROAD HYD
جناح
کیاپ فیکٹری
نظام شاہی روڈ
حیدرآباد دکن

بھنورے بھی پھولوں میں " ممی کیسٹر ہیئر آئیل " کی
خوشبو تلاش کر رہے ہیں۔
وٹامن (ایف) کی آمیزش نے ملائمت۔
گرتے ہوئے بالوں کو
ازسرنو اُگانے
اور درازی گیسو کی
ضمانت دی ہے
آپ
اس مقبول عام
" ہیئر آئیل "
کو
استعمال فرمائیے
سول ڈسٹری بیوٹر دی مینجر دلفریب سوپ اینڈ ہیئر آئیل کمپنی
عیسیٰ میاں بازار۔ حیدرآباد دکن

"ایوان"

(ماہنامہ)

اگست ۱۹۴۷ء

مدیر
سید مختار محمد کرمانی

مہتمم
شفیع اختر

...ندہ سالانہ للعہ	جلد ۲	فہرست	شمارہ (۱)	فی پرچہ ۶

بھنورے بھی پھولوں میں " ممی کیسٹر ہیر آئیل " کی
خوشبو تلاش کر رہے ہیں۔
وٹامن (یف) کی آمیزش نے ملائمت۔
گرتے ہوئے بالوں کو
از سر نو اُگانے
اور درازی گیسو کی
ضمانت دی ہے
آپ
اس مقبول عام
" ہیر آئیل "
کو
استعمال فرمائیے
سول ڈسٹری بیوٹر دی منیجر دِلفریب سوپ اینڈ ہیر آئیل کمپنی
عیسیٰ میاں بازار۔ حیدرآباد دکن

"ایوان"

(ماہنامہ)

اگست ۱۹۴۷ء

مدیر
مختار محمد کرمانی

مہتمم
شفیع اختر

رسالہ آلہ آباد	جلد ۲	فہرست	شمارہ (۱)	فی پرچہ ۶

بھونرے بھی پھولوں میں " ممی کیسٹر ہیر آئیل " کی
خوشبو تلاش کر رہے ہیں۔
وٹامن (یف) کی آمیزش نے ملائمت۔
گرتے ہوے بالوں کو
از سرِ نو اُگانے
اور درازی گیسو کی
ضمانت دی ہے
آپ
اس مقبول عام
" ہیر آئیل "
کو
استعمال فرمایئے
سول ڈسٹربیوٹر دی منیجر دلفریب سوپ اینڈ ہیر آئیل کمپنی
عیسیٰ میاں بازار۔ حیدرآباد دکن

ایوان

(ماہنامہ)

اگست ۱۹۴۷ء

مدیر
ید مختار محمد کرمانی

مہتمم
شفیع اختر

ندہ سالانہ للعہ | جلد ۲ | فہرست | شمارہ (۱) | فی پرچہ ۶

تعارف

جناب عطا وجدانی ایم۔ اے نے محکمہ تعلیمات کیلئے ایک نئی تجویز پیش کی ہے جس کا عنوان ہے "مشاعرہ اور تعلیمات" لیکن محکمہ تعلیمات کا یہ منظور شدہ مسئلہ ہے کہ "شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا" ہمیں توقع ہے کہ ناظرین عطا صاحب کی اس قیمتی رائے سے اتفاق فرماتے ہوئے محکمہ تعلیمات کو متوجہ فرمائیں گے۔

جناب محی الدین عرفان الہ آبادی ایوان کے قدیم سرپرست ہیں۔ آپکا ہر افسانہ اصلاحی ہوتا ہے "ہندوستانی لڑکی" میں آپ عرفان کے تخیل کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس میں حسن وعشق کے علاوہ اصلاحی پہلو بھی ہے۔

جناب نصیر سہوی سے ہر شخص اب آگاہ ہو چکا ہے آپکا کلام اکثر ادبی رسالوں میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ یہ "ایوان" کی خوش قسمتی ہے کہ ابتداہی سے انکو آپکی سرپرستی حاصل ہے آپ کے کلام میں گل وبلبل کے افسانے نہیں ہوتے بلکہ درد وکرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں ہوتی ہیں جو مسلم قوم کو بیدار کرنے کے لئے دل کے خون سے لکھی جاتی ہیں "جوانی کے دورخ" میں آپ شاعر کے جذبات کا اندازہ لگا سکیں گے

جناب عشرت انصاری کو کون نہیں جانتا آپ کا قلم جب کبھی کوئی پلاٹ ڈھونڈتا ہے تو وہ اصلاح کی طرف مائل پرواز نظر آتا ہے یوں تو آپ کے افسانوں میں حسن وعشق ہوتا ہے مگر اسکے ساتھ ساتھ اصلاحی عنصر اتنا غالب نظر آتا ہے کہ حسن وعشق ماند پڑ جاتا ہے۔ موصوف بھی ایوان کے ہمدرد سرپرستوں میں سے ہیں آپ نے "برج" جیسے ریڈیائی ڈرامہ کو بھیجکر ایوان کے صفحات روشن فرمادئے۔ خواتین کی زبان میں خواتین کی آپ بیتی ملاحظہ فرمایئے۔

جناب قمر ہاشمی آپ کے نام سے پورا ہندوستان واقف ہے لیکن جو کرم اور مہربانی "ایوان" پر ہے شائد اور کسی پر نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ماہ آپکا کلام بلاغت ایوان کے صفحات پر نظر آئے گا "یادوطن" میں آپ محسوس فرمائیں گے کہ شاعر اپنے گذرے ہوئے زمانے کو کسطرح یاد کرتا ہے اور جوش وخروش حب الوطنی کا اس نظم میں نمایاں ہے اس سے ہر شخص درس لے سکتا ہے۔

جناب سرشار صدیقی

ہندوستان کو فخر کرنا چاہئے کہ وہ ایسے بھی شاعر رکھتا ہے جن کے دل میں غریبوں کی ہمدردی کیلئے جگہ ہے جس کی تمناؤں میں غریبوں کی بہبودی و فلاح کا جذبہ پرورش پا رہا ہے جو ان راستوں اپنی منزل کی اور بڑھ کے ہندوستانیوں کی ترقی و کامرانی کیلئے راہ ہموار کر رہا ہے " سرمایہ داری " میں آپ ملاحظہ فرمائیے کہ جناب سالک الہامی کے جذبات کی ترجمانی فرماتے ہوئے، سرشار خود سرشار ہو گیا ہے۔

جناب نشاط القادری

موصوف پہلی دفعہ " پاگل " جیسی بلند پایہ ہندی نظم روانہ فرما کر " ایوان " کی سرپرستی فرمائی ہے یوں تو " ایوان " ہندی زبان کی پرورش کا قائل نہیں مگر یہ نظم اتنی دلکش تھی کہ ہمیں بغیر چوں و چرا کے اپنی پالیسی کو خیرباد کہدینا پڑا۔ اور یہ نظم آپ اسی پرچہ میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

جناب اکرم الہ آبادی
(جرنلسٹ)

آپکی ہستی کچھ تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نویس بھی آپ نے ابتداء سے جو ایوان کی سرپرستی فرمائی ہے اس کا میں بے حد ممنون ہوں لیکن اس وقت آپ تین ماہناموں کے ایڈیٹر ہو چکے ہیں۔ شبہ ہے کہ مصروفیت کہیں " ایوان " کو مایوس نہ کر دے۔ آپکا افسانہ " زہرہ سیلے " اور ایک نظم " میرے حضور کیوں " دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

جناب حامد حیدرآبادی

حیدرآباد کا یہ کمسن شاعر آج کل " فلمی دنیا " کی الجھنوں میں جکڑا ہوا ہے ہمیں اس ہونہار شاعر سے اچھے توقعات تھے مگر ان فلم سازوں کا برا ہو کہ انکی نظر انتخاب ہمیشہ شگفتہ پھولوں پر ہی پڑتی ہے۔ فلم " تبسم " کے تمام گانے اسی شاعر کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ فلم میں کوئی جان نہیں مگر اطلاعات نے یہ عیاں کر دیا کہ گانے انتہائی لاجواب ہیں۔ شدید اصرار پر موصوف نے " فلمی دنیا کی سیر " پر ایک بسیط مضمون روانہ فرمایا ہے جو اقساط کے ساتھ ہر ماہ " ایوان " میں شائع ہوتا رہیگا۔ ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلمی دنیا کیا بلا ہے اور وہاں ہوتا کیا ہے یہ ایک اہم مضمون ہے جو آج کل کے نوجوان کیلئے درس عبرت رکھتا ہے۔

مسٹر خواہ مخواہ

آپ کی " گشت " ہر ماہ شائع ہوتی رہی اور ناظرین نے اس حصے کو بے حد پسند فرمایا چونکہ اس وقت " خواہ مخواہ " انتہائی مصروف ہیں اس لئے آیندہ سے آپکی گشت کا سلسلہ شائع نہ ہوگا براہ کرم ناظرین اصرار نہ فرمائیں۔

سید خورشید علی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شکر کھیڑے کی جنگ

فتح کے بعد

حضرت مغفرت مآب نے بہت کوشش فرمائی۔ کہ مبارز خان کو جنگ سے باز رکھیں۔ خطوط لکھے۔ معتبر قاصد بھیجے۔ سمجھانے کی ہر ممکنہ تدبیر اختیار فرمائی۔ لیکن ان مساعی کا کوئی اثر نہ ہوا مبارز خان کی پیش قدمی کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ مجبوراً آپ کو بھی مدافعت کے لئے نکلنا پڑا۔ بالآخر پنجشنبہ ۲۳ محرم الحرام ۱۱۳۷ھ کو سہ پہر سے قبل اورنگ آباد سے چالیس کوس پر مضافات برار قصبہ شکر کھیڑہ کے نواح میں مقابلہ کی نوبت آئی۔ ایک پہر دو گھڑی خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ مبارز خان اس کے دو فرزند کئی افسروں اور ہزارہا سواروں اور پیادوں کے قتل اور نواب مغفرت مآب کی فتح پر جنگ کا خاتمہ ہوا۔

مبارز خان کی فوج کے جو افسر مارے گئے ان میں مسعود خان۔ اسعد خان۔ بہادر خان۔ امین خان دکھنی۔ غالب خان۔ عبدالفتاح خان۔ دلیر خان۔ خان زماں خان۔ مرب بیگ خان سید عبدالوہاب خان بہت نامی تھے اور خاص حیثیت رکھتے تھے۔

مبارز خان کی فوج کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ تھی۔ اس لشکر کا بُری طرح قلع قمع ہوا صرف ایک مرکز پر چار ہزار سوار جو بڑی بہادری سے جم کر لڑ رہے تھے اور ان میں سے اکثر

گھوڑوں سے اُتر پڑے تھے اور پیادہ ہو کے مقابلہ کر رہے تھے قتل ہوئے کُشتوں کے پشتے لگ گئے۔ صرف اس جگہ کے زخمیوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ تھی۔ اس رزم گاہ کے اطراف واکناف میں جو قتل اور زخمی ہوئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ بہت کم کوئی اس جگہ سے جان سلامت لے کے نکل سکا۔ دو ہزار سات سو گھوڑے اور دو ہاتھی ہلاک ہوئے۔ پیادہ فوج کے بھی بے شمار سپاہی مارے گئے۔

اسیران جنگ کی تعداد بڑی تھی۔ مبارز خان کے دو سرے دو فرزند خواجہ محمود خان و خواجہ حامد اللہ خان نیز دلاور خان۔ عزت بیگ خان۔ محمد بیگ خان۔ حکیم عزت طلب خان۔ قزل باش خان۔ میر ابوالفضل خان۔ رضا محمد خان اور آقا ابوالحسن سوانح نگار سرکار مچھلی بندر وغیرہ ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محمد بیگ خان اور عزت بیگ خان بہت سخت زخمی ہوئے تھے۔ دو تین روز تک وہ زندہ رہے۔ اِن کے علاج و تیمارداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی لیکن وہ جان بر نہ ہو سکے۔

نواب مغفرت مآب کی فوج زیادہ نہ تھی۔ دشمن کی فوج کی ایک چوتھائی کے برابر سوار اور پیادے تھے۔ اس کے باوجود آپ کی فوج کو بہت کم نقصان پہونچا۔ نامی گرامی افسران فوج میں صرف ظہیر الدولہ رعایت خان جو آپ کے قریبی عزیز تھے اور سلیمان خان میدان جنگ میں ہلاک ہوئے۔ سید غضنفر خان کا زخموں کی شدت کے سبب دو تین روز بعد انتقال ہوا۔

دونوں جانب کے مقتولین کی تکفین و تدفین اور مجروحین کی مرہم پٹی اور علاج وغیرہ کے ضروری اور مناسب انتظام کے بعد آپ نے اورنگ آباد کو مراجعت فرمائی۔ شکر کھیڑے کا نام فتح کھیڑہ تجویز فرمایا۔

اس اثنار میں بارگاہ سلطانی سے فرمان صادر ہوا۔

ورود مسعود فرمان والاشان مرحمت عنوان کہ ہر سطرش بہ اشتمال کلمات

مکرمت آیات، واندراج فطرات سمات برائے این تشنہ آب زلال الطاف و
بندہ پروری بوجہ آب حیات بود درعشرت کدہ فخر ومباہات سعادت اندوز تقدیم
آداب تسلیمات ساخت ۔

(عرضداشت نواب مغفرت آب
انشاء رام سنگہ منشی حضرت مغفرت آب)

بعدازیں بادشاہ بہ استمالت نواب کوشید ۔ وہمیشہ بہ ارسال فرامین
عنایت وبذل انعامات مخصوص می ساخت ۔

(سرو آزاد)

چون نسیم فتح وفیروزی بر پرچم لوائے اولیائے دولت این عالی جناب
وزیر محمد شاہ بادشاہ نادم شدہ بہ استمالت نواب کوشید

(مآثر نظامی)

حضرت مغفرت مآب نے عرضداشت کے ذریعہ شہنشاہ دہلی کی خدمت میں جنگ کی تفصیلات
عرض کیں ۔

امرائے دکن کے نام بھی عنایت نامے ارسال فرمائے ۔ یہ عنایت نامے تقریباً ایک ہی مضمون
کے تھے ۔ ان میں جنگ کے واقعات کے اظہار کے بعد ہر مکتوب الیہ کے مناسب حال آخر میں چند علحدہ
سطریں تحریر کی گئی تھیں ۔ کسی میں مکتوب الیہ کے کسی عزیز کی ہلاکت پر تعزیت تھی اور کسی میں
کسی کے متعلقہ اشخاص کے جنگ میں حاضر رہنے پر اظہار خوشنودی ۔
ازآن جملہ جو عنایت نامہ راجہ ساہو کو لکھا گیا تھا اسکی نقل لالہ منسارام کی کتاب مآثر نظامی
سے ذیل میں درج کی جاتی ہے :۔

مبارز خان را فساد طبیعت وبرگشتگی طالع در پیران سالگی بہ اقتضائے
عداوت سرِ وبہ اغوائے سبک مغزے چند ہوائے ریاست دکن در سر
افتادہ بہ رشتہ پاس حقوق واحسان ہا کہ وضیع وشریف را علم تفصیلی

آن حاصل است از دست داد و پا از جادہ حق شناسی و سخن شنوی فراتر گذاشت یعنی کارش از مرتبہ بہائم و سباع درگذشت ۔

اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ہُمْ اَضَلُّ

انجا رشتیِ فساد ارادہ اش بہ دلائل ساطعہ و حجج قاطعہ در قالب تفہیم و تحریر آمد و ابواب مراسلات موعظت آمیز مفتوح گشت ۔ اما بمقتضائے بیت مشہور ۔

بہ آب زمزم و کوثر سفید نتوان کرد
گلیم بخت کسے را بافتند سیاہ

آن زال سہل و آن پیر ابوجہل اصلاً و قطعاً بہ سخنان مفید و موثر اثر پذیر و نصیحت نیوش نگشتہ پائے شقاوت برجادہ مخالفت قائم نمودہ بادیہ پیمائے جہل و شرارت گردید و از کثرت نخوت و وفور غرور با وصف تکرار نصائح و تنبیہات از وبال مآل خون ریزی مسلمین مطلق نہ اندیشیدہ سوار و پیادہ بے شمار و توپ و جزائل و بان و کجنال و رہکلہ بسیار و بندوقچیان منتخب کرناٹکی زیادہ از حد و عدد و سرداران ممتحن بکار دیدہ جرار کہ بہ تطمیع و تذویر از اطراف و اکناف و جوانب آن ہا را فراہم آوردہ و رفیق جنگ و پرخاش ساختہ قطع مراحل و طے منازل نمودہ بہ ترتیب لشکر و تسویہ صفوف پرداختہ بہادر خان و پسر و برادر عبدالنبی خان و دلیر خان و جمع افاغنہ دست راست و دلاور خان با دو پسر دست چپ و غالب خان با فوج تمام و سعادت اللہ خان و امین خان دکھنی و سید عبدالوہاب خان

وقزل باش خان و محمد بیگ خان و فائق خان وجم غفیرے از نوکران خود هراول .
و (۳) پسر دیگر با فوج گران ملتمش طرح قرار داده و فوج بسته روز پنجشنبه بتاریخ
بیست و سیوم محرم سنه ۶ محمد شاهی مطابق سنه ۱۱۳۷ هجری در نواح قصبه شکر کهیره
چهل کروه از خجسته بنیاد معرکه آرائے نبرد گردید - سرداران ممتحن مذکور با سایر سپاه و کرناٹکی ها
برق انداز با بهادران نصرت قرین مانند خنازیر که با شیران و هژبران در افتند درآویخته
یک پهر و دو گهڑی به کارفرمائی آتش خانه و حمله هائے رستمانه داد تهور و جلاوت دادند -
دقیقه از دقائق کوشش فرو نه گزاشته از شدت گرمی هنگامه کارزار ابواب حیرت را
بر روئے تماشائیان ملا اعلی کشودند - آخر کار به مقتضائے اَلْحَقُّ يَعْلُوْ نسیم فتح و ظفر
از موهبت عنایت ازلی بر پرچم اهل حق وزیدن گرفت و خاشاک وجود شرارت
آمود آن سرگروه اشرار مع پسران و بهادر خان و امین خان دکهنی و متالب خان و پسر
و برادر عبد النبی خان و دلیر خان و خان زمان خان و عرب بیگ خان و سید عبد الوهاب خان
با جمع کثیر از مجاربه باد فنا رفت و اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً - در یک موضع چهار
هزار سوار که اکثر ازین ها پیاده شده به جنگ کوته یراق مبادرت نموده بودند به قتل رسیدند
و از کشته ها پشته ها شدند و دو هزار و هفت صد اسپ و دو فیل گشته شدند و بقیه غنیمت گشت و زیاده از دو هزار همه ها زخمی
افتادند و تتمه در اطراف و اکناف رزمگاه صریح و قتیل کشته شدند - حاصل که کم کسے از آن ها جان بر شد -
و از احوال پیاده هائے آن جا که مقتول گشتند چه توان نوشت که از حیز شمار خارج بودند
شهامت پناه باجی راؤ و تهوار دستگاه سلطان جی و جلادت انتباه پیلاجی در استیصال
مخالف ترددات شایان به تقدیم رسانیدند - مساعی جمیله این مردم که فی الحقیقت پرتو
اخلاص آن منیع الشان است بیش از بیش باعث خورسندی و خرمی خاطر دوستی مآثر شده -

او سجا نہ موستاں یک دل را دوست کام دار اد ۔

شاہنشاہ دہلی کے فرامین و نوازشات نے نواب مغفرت مآب کے عمل کی توثیق کردی ۔ آپ نے اورنگ آباد میں تقریباً ڈیڑھ ماہ قیام فرمایا اور ملک کے بندوبست میں مصروف رہے ۔

اوایل ربیع الاولیٰ میں اورنگ آباد سے کوچ فرمایا ۔ مختلف مقامات پر قیام اور انتظام فرماتے ہوئے اواخر ربیع الآخر میں حیدرآباد پہونچے اور گوشہ محل کے باغ میں نزول اجلال فرمایا ۔

مبارز خان نے اپنے ایک فرزند خواجہ احمد خان کو حیدرآباد میں اپنا نائب مقرر کیا تھا ۔ احمد خان کو جب اپنے والد کے قتل اور حضرت مغفرت مآب کے بہ قصد حیدرآباد روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو ۔ اس نے اپنے بھائی کے نائب صندل خان خواجہ سرا سے حملہ اور جنگ کر کے قلعہ گول کنڈہ حاصل کیا اور اس میں قلعہ بند ہوگیا ۔ کئی ماہ تک آپ کے عمال کا قبضہ نہ ہو سکا ۔ آپ نے قتل و خون ریزی پسند نہ فرمائی ۔ افہام تفہیم سے کام نکالنا چاہا ۔ بالآخر خواجہ احمد خان نے اطاعت قبول کی اور اوایل ۱۱۳۸ھ میں قلعہ کی کنجیاں آپ کی خدمت میں پیش کردیں ۔ نواب مغفرت مآب نے مبارز خان کے فرزندان و اقارب وغیرہ کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک فرمایا ۔ خواجہ احمد خان کو شہامت خان اور خواجہ محمود خان کو مبارز خان کے خطابات سے سرفرازی بخشی اور وافر محاصل کی عمدہ جاگیرات عطا فرمائیں ۔ مبارز خان کے اکثر و بیشتر متعلقین و وابستگان بھی انعام و اکرام سے مالامال ہوئے ۔ اس کے بعد آپ نے معقول انتظامات فرمائے ۔

نواب بہ بندوبست ملک و تنبیہ مفسدان و تادیب سرکشان و غم خواری حال زیردستان پرداختند ۔
(راحت افزا)

اسی سال پیش گاہ محمد شاہ شاہنشاہ دہلی سے نواب مغفرت مآب کو آصف جاہ کا خطاب سرفراز ہوا ۔

دریں ایام فرخندہ فرجام نواب والاجناب بہ عطائے خطاب آصف جاہ بلند آوازہ گردید ۔
(مآثر نظامی)

تمت بالخیر

ماہر القادری

درس عمل

ہیں مردِ مجاہد کے بھی انداز نرالے
رفتار قیامت کی ہے اور پاؤں میں چھالے

غازی نے چمکتی ہوئی تلوار اُٹھا لی
دیتا ہی رہا شیخ کتابوں کے حوالے

پیرانِ کلیسا کے فریبوں میں نہ آنا
یہ لوگ تو لکھ دیتے ہیں جنت کی قبالے[1]

بزم نگہ و دل میں کسی طرح بھی آ دوست
ہوتے نہیں بجلی کے چراغوں سے اُجالے

تہذیب جہاں سوز کی زد سے نہ بچیں گے
مندر نہ کلیسا نہ مساجد نہ شوالے

اے بلبلِ خوش رنگ و خوش آواز مری سن
نغمے جو ہوں بے کیف تو بن جاتے ہیں نالے

جلوے بھی مناظر بھی، محبت بھی مگر کیا
آنکھوں پہ حجابات، زبانوں پہ ہیں تالے

ماہر! میں محبت کے صحیفوں میں ملوں گا
ڈھونڈیں جو کبھی مجھکو مرے ڈھونڈنے والے

[1] تذکرات غفران

امجد علی نقّاد (حیدرآباد)

صفوی آرٹ

ایرانی مصوری کا نقطۂ عروج

(۴)

(۱) استاد کمال الدین بہزاد

استاد کمال الدین بہزاد کا ظہور، فن کی دنیا میں کمال کو بھی اپنے ساتھ لیتا آیا۔ یہ باکمال استاد پندرھویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوا تھا۔ زادگان شیخ صفی کے عروج اور تیموری خاندان کے انحطاط اور ان کے انتشار کو بہ نظر خود دیکھ بھی چکا تھا یا ساسانیوں کے بعد صفویوں کا ایرانی نژاد پہلا خاندان تھا۔ جس نے ایران پر اقتدار حاصل کیا تھا۔ حسن کاروں کی سوانح حیات کو نظر انداز کر جانا ایرانیوں کی پرانی عادت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہزاد کے حقیقی حالات زندگی کا کوئی سراغ نہیں لگتا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اُس زمانہ کے اہل قلم حضرات اس قدر بودے اور ڈرپوک واقع ہوئے تھے کہ متعصب علماء کی قوت، ان سے بے چون وچرا اپنے منشا کی پابندی کرا رہی تھی)۔ اسی وجہ سے فن تصویر کو مردود ٹھیرانے والے فتوؤں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تو رہا ایک طرف، زبان تک ہلانے کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ سرکار دو عالم کے اسوۂ حسنہ پر بے شمار کتابیں سپرد قلم کی ہیں۔ اور نہایت فخر کے ساتھ اپنے سلاطین سلف اور سورماؤں کے کارناموں کا احیا کیا ہے۔ لیکن مصورین کے بارے میں، خواہ وہ کتنا ہی مایۂ ناز حسن کار کیوں نہ ہو، ایک لفظ بھی لکھنا انہیں ہرگز گوارا نہ ہوتا تھا یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ جب تک کوئی مصور، شاعر یا خطاط (خوش نویس) نہ ہوتا اُسکو شہرت نہ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جن حسن کاروں کو عوام سے متعارف کروانے کا دعوی کیا جاتا ہے، انہیں حسن کار کے بجائے شاعر یا خطاط ہی کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا ہے۔ البتہ **تاریخ السیر** کا ایک نامی مصنف **خوندمیر** ایسا دکھائی دیتا ہے، جو علی الاعلان جرأت کے ساتھ فنون لطیفہ کی سرپرستی کرتا ہے۔ اسی مورخ نے بہزاد کے متعلق کچھ حالات زندگی بھی ضبط قلم کئے ہیں لیکن پھر بھی ان حالات سے اسکی حقیقی زندگی پر جیسی چاہئے ویسی روشنی نہیں پڑتی۔ خوندمیر کی تحریر کی وقعت پرجوش قصیدے سے زیادہ نہیں۔ تاہم بہزاد کے بارے میں ہمارے پاس صرف یہی ایک مستند حوالہ موجود ہے۔ جو یوں رقمطراز ہے کہ:۔

> "استاد کمال الدین بہزاد فن تصویر کے بینظیر
> شکلوں اور نوادر کو ہمارے پیش نظر کرتا ہے۔
> اس کی نقاشی مانی کے موقلم کی طرح دنیا کے
> مصوروں کے سارے کارناموں کو ماند کر دیتی ہے
> اس کی انگلیوں میں ایسی معجزنما قوت ودیعت
> ہوئی تھی کہ ان کی کارستانیوں نے اولاد آدم
> میں سارے مصوروں کے کارناموں کو ماند کر دیا۔
> اس کے موقلم کا ایک بال، بے جان پیکر میں
> جان ڈال دیتا ہے۔ امیر نظام الدین علی شیر
> کی مہربانیوں اور شفقت آمیز سرپرستی نے

استاد محترم کو بڑے رتبہ پر پہنچا دیا تھا۔ نیز
شاہ خاقان، سلطان حسین بیقارہ نے اپنی
خاص نوازشات اور عنایات بےغایات سے
اسے خوب نوازا ہے۔ اب تک بھی اس
صادق العقیدہ، یکتائے روزگار استاد کو سلاطین
عالم کی فیض رسانی کی عزت حاصل ہے۔
شاہان اسلام کی بے پایاں توجہ اس کے
شامل حال ہے۔ اور یقیناً ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔"

مذکورالصدر ستائش سے بہزاد کی عظمت کا پتہ ہی نہیں چلتا، بلکہ اس امر کا بھی مستحکم ثبوت مل جاتا ہے کہ ابتدائی زمانے سے آخر دم تک، اس کو کسی نہ کسی دربار کی سرپرستی ضرور حاصل رہی۔ استاد محنگ کے مکتب میں تربیت پانے کے بعد، سلطان حسین مرزا کے ہاں، جو زادگان تیمور سے تھا، ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلطان کی وفات کے بعد، شاہ اسمٰعیل صفوی کا درباری مصور مقرر ہوا۔ نیز طویل مدت تک شاہ طہماسپ کی دوستانہ صحبت سے فیض اٹھاتا رہا۔ بہزاد کی قسمت ایک روایت مشہور ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفویوں کے پہلے بادشاہ کی نظر میں اس کی بے حد قدر و منزلت تھی، کہا جاتا ہے کہ لڑائی کی ایک مہم میں بادشاہ سلامت بذات خود افواج کی کمان کا قصد رکھتے تھے۔ مہم پر روانہ ہونے سے قبل فرمایا کہ "خدانخواستہ مجھے شکست ہو یا دارالسلطنت پر غنیم کا قبضہ ہو جائے، تو مجھے، ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ شاہ محمود نیشاپوری اور استاد بہزاد میرے دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں" چنانچہ اسی خوف سے انہیں روپوش بھی کر دیا تاکہ دشمن ان پر اپنا ہاتھ نہ ڈال سکے۔ جنگ سے کامران لوٹتے ہی بادشاہ نے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ "کیا استاد بہزاد بخیر و عافیت ہیں" بابر شہنشاہ ہند نے اپنی خود نوشت تزک میں استاد بہزاد کو "تمام مصوروں میں برگزیدہ ہستی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ رائج الوقت کتب میں ایسے بے شمار حوالے پائے جاتے ہیں۔

بہزاد کے تصویری کارنامے

بہزاد کو زبردست شہرت اور بڑی مقبولیت حاصل تھی عوام بہزاد کے آرٹ کے بے حد شیدائی تھے۔ یہاں تک غلو کر جاتے تھے کہ کسی اچھی تصویر پر بہزاد کا نام لکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ ان کے ہاں بہزاد کے قلم کا بنا ہوا شاہکار موجود ہے حالانکہ وہ تصویر کسی دوسرے مصور کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہوتی۔ عوام کی ایسی مبالغہ آمیز و جنونانہ حرکات کی وجہ سے بہزاد کے قلم کی بنی ہوئی اصلی تصویروں کی شناخت کوئی آسان کام نہ رہا۔ بڑی ماہرانہ جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذیل کی چند تصاویر بہزاد ہی سے منسوب کیجاتی ہیں:۔

(۱) درویش کی تصویر
(۲) کوچک درویش (ذخیرۂ گلوبیون)
(۳) یک درویش۔ (قومی کتب خانہ پیرس)
(۴) بغدادی درویش کی شبیہ۔
(۵) حسین مرزا کی شبیہ کا چربہ (بوسٹن میوزیم امریکہ
(۶) تیرانداز گھوڑے سوار۔
(۷) ایک امیر کی شبیہ۔ اس پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں لیکن تصویر بہزاد کے مکتب کے کسی مصور نے بنائی ہے
(۸) "شخصے دست در پالہنگ" کی شبیہ۔ یہ تصویر عرصہ سے طویل بحثوں کا موضوع بنی ہوئی ہے کہ آیا بہزاد کا کارنامہ ہے یا نہیں۔

بہزاد سے منسوب کئے جانے والے مسودات یا مصور قلمی

(۱) **ظفرنامہ** ۔ تیمور گورگان کی سرگذشت مصنفہ **شرف الدین علی یزدی** مورخہ ۸۲۵ھ [کتابت] **شیر علی** نے کی ہے۔ یہ نسخہ کسی زمانے میں شاہان مغلیہ

قبضہ میں تھا، جو اسوقت گیرٹ ذخیرہ میں پایا جاتا ہے ۔

(۲) **نظامی صاحب کی تصنیف ہفت پیکر"**

تصویریں، جو پہلے مسٹر گوارج صاحب کی ملک تھیں ان میں تیموری دبستان تصویر کے ابتدائی طرز کا کام پایا جاتا ہے ۔

(۳) **بوستان سعدی** کی چند بڑی تصویریں بنائی تھیں ان میں کی ایک تصویر اسوقت خدیو مصر کے کتب خانہ قاہرہ میں محفوظ ہے

(۴) **خمسۂ امیر خسرو دہلوی**، مورخہ سنہ ۸۹۰ھ میں (۳۰) تصویریں شامل ہیں ۔ اس وقت مسٹر چیسٹر بیاٹی کے ہاں موجود ہے ۔

(۵) **نظامی صاحب کا نسخہ** مورخہ سنہ ۸۴۶ھ میں (۲۰) تصویریں بنائی گئی ہیں ۔ برطانوی عجائب گھر میں موجود ہے ۔ جس میں اعلیٰ ترین فرزانگی کے آخری مظاہرات کا عکس نظر آتا ہے ۔

(۶) کچھ عرصہ بعد کی، بہزاد کے قلم سے بنی ہوئی چند تصویریں اسینٹ پیٹرس برگ (لینن گراڈ) کے کتب خانے کی زینت بنی ہوئی تھیں

بہزاد کے کارنامے کثرت سے مختلف ذخیروں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں اگر حقیقت میں یہ سارے شاہکار اس کے قلم کے رہین منت نہ بھی ہوں، تب بھی یہ ضرور ہے کہ اس کی اتباع کرنے والے مصوروں نے انہیں بہزادی طرز میں ڈھالا ہے ۔

ایرانی فن تصویر میں، بہزاد نے جن محاسن اور خوبیوں کا اضافہ کیا ہے، اُن کے متعلق اظہار رائے کرنے میں ہمیں مبالغہ آرائیوں سے کام لینے کی ضرورت نہیں ۔ البتہ اسقدر جتلا دینا کافی ہوگا کہ بہزاد کے شاہکاروں میں زبردست استادانہ تخیل کاری اور دست درزی کی ایسی ماہرانہ قابلیت پائی جاتی ہے ۔ جو تکمیل فن پر اپنی مہر ثبت کردیتی ہے ۔ نہ صرف تمثیل نگار بلکہ شبیہ کش مصور کی حیثیت سے بھی بہزاد فن کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا تھا، جہاں تک کہ اس سے قبل یا بعد کا کوئی مصور پرواز نہ کرسکا ۔ اسی بناء پر تو اب یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ ایرانی آرٹ کا مرقع دنیا کے ہر آرٹ کے مقابلہ میں اس کے دوش بدوش کھڑے رہنے کے قابل ہے

تصوف کا اثر

ایرانی آرٹ میں بہزاد کی قدر و منزلت کے بارے میں جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ عزت اپنی تخیل کاری کے لازمی نتیجہ کے طور پر حاصل نہیں کی تھی، بلکہ عوام کے قلب پر اپنی توارثی رومان پرستی جیسے تصوف کا سکہ بٹھا کر پیدا کی تھی ۔ آرٹ میں عشق الٰہی کے عنصر کو شامل کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ بہزاد صوفیائے کرام کے مسلک سے بے حد متاثر ہو چکا تھا ۔ اس کی ولادت اور تعلیم و تربیت کے نازک دور میں، تصوف ایران کے طول و عرض میں مقبول خاص و عام تھا ۔ اس طرح تصوف، فنون لطیفہ میں روحانی کشش والفا کا باعث ثابت ہوتا ہے ۔ حضرت جلال الدین رومی، ایران کے مایۂ ناز متصوفین شعراء میں سے ہے، آپ کا انتقال ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا ۔ خدا کے متوالے حافظ شیرازی نے تخیلات اور وجدانیات کی انتہائی باریکیوں کے اظہار پر کامیابی سے قابو پالیا تھا ۔ ایرانی شاعری کی کیف پرور موسیقی، حافظ صاحب سے پیشتر اس طرح کبھی نغمہ سرا نہ ہوئی تھی ۔ جامی صاحب تو عشق حقیقی کی شمع پر شمس پروانہ اپنی جان دیتے تھے ۔ ان شہادتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے کی فضا مذہبی سرگرمیوں سے مالامال تھی تصوفی رموز پسندی، ایرانی زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی تھی ۔

صوفیا کا ایقان تھا کہ تکوین عالم سے پہلے بھی روح کا وجود تھا ۔ جب تک عالم علوی کے اعلیٰ ترین حسن کی حقیقت یعنی کماحقہ، واقفیت حاصل نہ کی جائے، حسن کی کاملیت کا

ادراک ممکن نہیں ۔ یہ بھی وثوق کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ روح اور جسم کے درمیان مادیت کا پردہ حائل ہے۔ باوجود اس کے ہم روح کو سمجھ سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔ روح کی حقیقت سے آگاہی کے ساتھ عشق الٰہی کی وجد آفرین ریاضتوں کی مدد سے رموز الٰہی کا سمجھنا ممکن ہے۔ کائنات کی تکوین کو مظہر حسن اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ الٰہی صفات حسنہ کا ظہور نمایاں ہے اور زندگی میں اس کا کام خدا شناسی ہے۔

ایسا زمانہ جس میں مذہبی جوش کا یہ عالم ہو، کم سن بہزاد صوفیائے کرام کی صحبتوں میں شریک رہ کر ان سے فیض اٹھاتا تھا۔ اور یہ خدا پرست لوگ جن خوش آیند خوابوں، رویا اور کشف کو قصے کی شکل میں بیان کرتے تھے، سن کر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الوہیت فہمی کے مقصد اعظم ([illegible]) کی فسوں سازی اور فطرت مذہب کی ہیجان آفرینی کے زیر اثر اس نے صوفیانہ تخیلات کو یہاں تک نشو و نما دی کہ آخر کش اس کی دلی آرزو پوری ہو گئی۔ اور اسی روحانی قوت کا مظاہرہ صدیوں سے آج تک، اس کے آرٹ کے سخت ترین نقادوں کی مادی نظروں کو خیرہ کئے ہوئے ہے۔ ان شاہکاروں کی ایک ہی نظارہ سے تماشائی حیرت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اور جن عمیق روحانی تجربات کو ان کارناموں میں بلباس مجاز منعکس کیا گیا ہے۔ ان کو سلجھے ہوئے طریقہ پر بیان کرنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے اس لئے ایسے حسن سے لطف اندوز ہونے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کی تعریف ہی نہ کی جائے، بلکہ اسی کو اپنی تعریف کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ہماری روح پر منکشف ہو کر ہماری باطنی قوتوں اور تجربوں کی دنیا کو بیدار کرے، جس کی واقفیت پر آرٹ کی سچی مسرت کا دارومدار ہے۔

(۴) میرک اور اس کے کارنامے

ایران کی تصویری تاریخ میں استاد کمال الدین بہزاد کے بعد، اس کے شاگرد رشید آقا میرک، بڑا استاد گزرا ہے۔ اس اصفہانی سید کو ابتدا ہی سے ہاتھی دانت سادہ کار اور خوشنما نقاشی کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ میرک کا بہت تھوڑا کام ہم تک پہنچا ہے، جس کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ میرک نے اس کثرت سے کام نہیں کیا جتنا کہ اس کے استاد بہزاد نے کیا تھا۔ اس قلت کی سوائے اس کے اور کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

میرک کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک تصویر جینی کے مرقع میں منسلک ہے۔ اور چار تصویریں سنہ ۱۲۵ھ کے ایک قلمی نسخہ میں شامل ہیں جو کسی زمانے میں نورالدین جہانگیر شہنشاہ ہند کے پاس تھا۔ نظامی صاحب کے قلمی نسخے مورخہ سنہ ۹۹ھ میں پانچ کتابی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ نظامی صاحب کے سنہ ۹۴۶ھ تا سنہ ۹۴۷ھ کے قلمی نسخہ کی بعض تصویریں برطانوی عجائب گھر میں بھی رکھی ہوئی ہیں۔

میرک کے کارناموں کا ناقدانہ جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہزاد کے مقابلے میں میرک کو تیموری روایات فن سے بہت کم نجات ملی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ میرک کا کام بالکل سادہ ہوتا ہے، تاہم اس کے پیکری اشکال سے تیموری درشتی ہویدا ہوتی ہے۔ البتہ اس کے مستعملہ رنگ ایسی درخشندگی اور تنویر سے معمور ہوتے ہیں، جس سے تصویروں میں خوشنمائی، دلکشی اور تنزیہی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرک ایک باکمال فن داں ضرور تھا، لیکن اس کے شاہکار اپنے استاد بہزاد کے مقابلہ میں آتے ہی ایسے ماند پڑ جاتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کا فرق فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔

شیخ سعد احمود

کو کمال الدین بہزاد اور آقا میرک، دونوں کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ اور بہزاد کے سلاطین شیبانیہ کے دربار میں کام بھی کرتا تھا۔ محمود نے

اس فن کو اپنے مشفق اساتذہ سے سیکھا تھا۔ اُس پر اس خلوص و یقین کے ساتھ عمل کرتا تھا کہ بعض اوقات اس کے شاہکاروں کو بہزاد اور میرک جیسے شہرہ آفاق اساتذہ کے شاہکاروں سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سعد محمود کی اکثر تصویریں اس وقت ڈاکٹر ڈموٹ کے قبضہ میں ہیں جن کو موصوف نے کتابوں کے شوقین عبد العزیز عبد العزیز بہادر خان ازبیگ سلطان بخارا کے کتب خانہ شاہانیہ سے حاصل کیا ہے۔ اس شہنشاہ عالی وقار کے لئے سعد محمود نے بہتیری تصویریں بنائی تھیں جن میں سے ایک تو یہ **تصویری مجموعہ** میں شامل ہے، جس کی دو تصویریں استاد بہزاد کے قلم کی رہین منت ہیں اور سنہ ۹۴۴ھ کا **نظامی صاحب کا مصور نسخہ** اور **بوستان سعدی** سنہ ۹۶۳ھ کی قابل دید کتب پیرس کے قومی کتاب گھر کو زینت بخش رہی ہیں۔

اسی زمانے کی اور بھی تصویریں اب تک محفوظ ہیں جنہیں دبستان بخارا کے ارکان نے اپنے زور قلم کے جوہر دکھانے کی غرض سے تشکیل کی تھی۔ مثال کے طور پر **گلستان سعدی** کا قلمی نسخہ سنہ ۹۵۰ھ میں بمقام بخارا، بطرز بہزاد مصور کیا گیا اور **سکندر کا اژدہے سے برسر پیکار ہونے کی تصویر** سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی حسن کار اس زمانے کے یورپی آرٹ سے بھی خوب واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس تصویر کی ترتیب بالکل اُس تصویر سے ملتی جلتی ہے، جس میں سینٹ جارج اژدہے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

دبستان بخارا کے اکثر مصورین، جنہوں نے اپنے شاہکاروں کو بہزاد ہی اثر کے تحت متشکل کیا ہے، عرصہ دراز سے قعر گمنامی میں پڑے ہیں۔ ان سب کو رفتہ رفتہ منظر عام پر لانے کا کام ابھی باقی ہے۔ طرح اندازی میں وضاحت تصور، اور رنگ نویسی میں زور قلم کے مظہر چند برجستہ نشانات، ان شاہکاروں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ لیکن افسوس کہ سولہویں صدی کے آغاز ہی سے اس دبستان نے ایسا دم توڑا کہ پھر آج تک اس میں جان نہ پڑ سکی۔

ادراک ممکن نہیں۔ یہ بھی وثوق کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ روح اور جسم کے درمیان مادیت کا پردہ حائل ہے۔ باوجود اس کے ہم روح کو سمجھ سکتے ہیں اور دیکھ بھی سکتے ہیں۔ روح کی حقیقت سے آگاہی کے ساتھ عشق الٰہی کی وجد آفرین ریاضتوں کی مدد سے رموز الٰہی کا سمجھنا ممکن ہے۔ کائنات کی تکوین کو مظہر حسن اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ الٰہی صفات حسنہ کا ظہور شامل ہے اور زندگی میں اس کا کام خداشناسی ہے۔

ایسا زمانہ جس میں مذہبی جوش کا یہ عالم ہو، کم سن بہزاد صوفیائے کرام کی صحبتوں میں شریک رہ کر ان سے فیض اٹھاتا تھا۔ اور یہ خداپرست لوگ جن خوش آیند خوابوں، رویا اور کشف کو قصے کی شکل میں بیان کرتے تھے، سن کر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الوہیت فہمی کے مقصد اعظم (Glorification) کی فسوں سازی اور فطرت مذہب کی ہیجان آفرینی کے زیر اثر اس نے صوفیانہ تخیلات کو یہاں تک نشو و نما دی کہ آخر کار اس کی دلی آرزو پوری ہو گئی۔ اور اسی روحانی قوت کا مظاہرہ صدیوں سے آج تک، اس کے آرٹ کے سخت ترین نقادوں کی مادی نظروں کو خیرہ کئے ہوئے ہے۔ ان شاہکاروں کی ایک ہی نظارہ سے تماشائی حیرت کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ اور جن عمیق روحانی تجربات کو ان کارناموں میں بلباس مجاز منعقد کیا گیا ہے۔ ان کو سلجھے ہوئے طریقہ پر بیان کرنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے اس لئے ایسے حسن سے لطف اندوز ہونے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کی تعریف ہی نہ کی جائے، بلکہ اسی کو اپنی تعریف کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ہماری روح پر منکشف ہو کر ہماری باطنی قوتوں اور تجربوں کی دنیا کو بیدار کرے، جس کی واقفیت پر آرٹ کی سچی مسرت کا دارومدار ہے۔

(۲) میرک اور اس کے کارنامے

ایران کی تصویری تاریخ میں استاد کمال الدین بہزاد کے بعد، اس کے شاگرد رشید آقا میرک، بڑا استاد گزرا ہے۔

اس اصفہانی سید کو ابتدا ہی سے ہاتھی دانت سادہ کار اور خوش ادا نقاش کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ میرک کا بہت تھوڑا کام ہم تک پہنچا ہے، جس کے پیش نظر یہ خیال ہوتا ہے کہ میرک نے اس کثرت سے کام نہیں کیا جتنا کہ اس کے استاد بہزاد نے کیا تھا۔ اس قلت کی سوائے ان کے اور کوئی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

میرک کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک تصویر جہنی کے مرقع میں منسلک ہے۔ اور **چار تصویریں** سنہ ۱۱۲۵ھ کے ایک قلمی نسخہ میں شامل ہیں، جو کسی زمانے میں نورالدین جہانگیر شہنشاہ ہند کے پاس تھا۔ **نظامی صاحب کے قلمی نسخے** مورخہ سنہ ۸۹۹ھ میں پانچ کتابی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ **نظامی صاحب** کے سنہ ۹۴۶ھ تا سنہ ۹۴۷ھ کے قلمی نسخہ کی بعض تصویریں برطانوی عجائب گھر میں بھی رکھی ہوئی ہیں۔

میرک کے کارناموں کا ناقدانہ جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہزاد کے مقابلے میں میرک کو تیموری روایات فن سے بہت کم نجات ملی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ میرک کا کام بالکل سادہ ہوتا ہے، تاہم اس کے پیکری اشکال سے تیموری درشتی ہویدا ہوتی ہے۔ البتہ اس کے مستعمل رنگ ایسی درخشندگی اور تنوع پر ستے مامور ہوتے ہیں، جس سے تصویروں میں نمائشی دلکشی اور تنزیہی دبستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرک ایک باکمال فن کار ضرور تھا، لیکن اس کے شاہکار اپنے استاد بہزاد کے مقابل میں آتے ہی ایسے ماند پڑ جاتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کا فرق فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔

شیخ سعد محمود

کو کمال الدین بہزاد اور آقا میرک، دونوں کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ اور ایران کے سلاطین شیبانیہ کے دربار میں کام بھی کرتا تھا۔ محمود

جس فن کو اپنے مشفق اساتذہ سے سیکھا تھا۔ اُس پر اس خلوص و یقین کے ساتھ عمل کرتا تھا کہ بعض اوقات اس کے کارناموں کو بہزاد اور میرک جیسے شہرہ آفاق اساتذہ کے شاہکاروں سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سعدا محمود کی اکثر تصویریں اس وقت ڈاکٹر ڈموٹ کے قبضہ میں ہیں جن کو موصوف نے کتابوں کے شوقین عبدالعزیز عبدالعزیز بہادر خان ارینگ سلطان بخارا کے کتب خانہ شہابیہ سے حاصل کیا ہے۔ اس شہنشاہ عالی وقار کے لئے سعدا محمود نے بہتیری تصویریں بنائی تھیں جن میں سے ایک تو **تصویری مجموعہ** میں شامل ہے، جس کی دو تصویریں استاد بہزاد کے قلم کی رہین منت ہیں اور سنہ ۹۴۴ھ کا **نظامی صاحب کا مصور نسخہ** اور **بوستان سعدی** سنہ ۹۶۳ھ کی قابل دید کتب پیرس کے قومی کتاب گھر کو زینت بخش رہی ہیں۔

اسی زمانے کی اور بھی تصویریں اب تک محفوظ ہیں جنہیں دبستان بخارا کے ارکان نے اپنے زور قلم کے جوہر دکھانے کی غرض سے تشکیل کی تھی۔ مثال کے طور پر **گلستان سعدی** کا قلمی نسخہ سنہ ۹ھ میں بمقام بخارا، بطرز بہزاد مصور کیا گیا اور **سکندر کا اژدہے سے برسر پیکار ہونے کی تصویر** سے پتہ چلتا ہے کہ ایرانی حسن کار اس زمانے کے یورپی آرٹ سے بھی خوب واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس تصویر کی ترتیب بالکل اُس تصویر سے ملتی جلتی ہے، جس میں سینٹ جارج اژدہے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔

دبستان بخارا کے اکثر مصورین، جنہوں نے اپنے شاہکاروں کو بہزاد ہی اثر کے تحت متشکل کیا ہے، عرصہ دراز سے قعر گمنامی میں پڑے ہیں۔ ان سب کو رفتہ رفتہ منظر عام پر لانے کا کام ابھی باقی ہے۔ طرح اندازی میں وضاحت تصور، اور رنگ نویسی میں زور قلم کے مظہر چند برجستہ نشانات، ان شاہکاروں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ لیکن افسوس کہ سولہویں صدی کے آغاز ہی سے اس دبستان نے ایسا دم توڑا کہ پھر آج تک اس میں جان نہ پڑ سکی۔

نظم

قمر ہاشمی

یادِ وطن

(زیر طبع مجموعہ "تیشہ و چنگ" کا ایک نقش)

وہ میرا گھر مسرت کا جہاں خوشیوں کا گہوارا !
جہاں پر میں نے فردوسی محبت کا سبق پایا !!
جہاں سر پر بزرگوں کا ہمیشہ ہی رہا سایا !!!

مگر افسوس اب ایسی زمیں سے ہوں میں بیگانہ !
وطن کی یاد آتی ہے تو ہو جاتا ہوں دیوانہ !!

وطن کی سرزمیں ہے رشکِ خلدِ بریں ہمدم !
فلک کو رشک ہے جس پر وہ ایسی ہی زمیں ہمدم !!
جہاں جھکتی ہی رہتی ہے عقیدت کی جبیں ہمدم !!!

وہ شاید سرزمین ٹونک[ل] ہے اب دور ہوں جس سے !
مگر اب بھی وطن کی یاد سے سرشار ہوں جس سے !!

وہ مکتب جس میں گزرے میرے بچپن کے سہانے دن !
وہ بچپن کے حسیں لمحے جوانی کے وہ میرے دن !!
وہ مکتب آہ! گزرے ہیں جہاں میرے خوشی کے دن !!!

لہ - میرا وطن ریاست ٹونک (راجپوتانہ)

وہ دو ساتھی حقیقت میں جو تھے اخلاص کے پیکر!
مصیبت اور خوشی میں ساتھ ہی رہتے نظر[1] جوہر[2]!!

مگر افسوس اب جوہر کو ہم ہرگز پا نہیں سکتا!
میں چاہوں بھی تو میرے پاس اب وہ آ نہیں سکتا!!
خدا مرحوم کو بخشے میں اُس تک جا نہیں سکتا!!!

وہ پُر اخلاص باتیں اُسکی اکثر یاد آتی ہیں!
ہمیشہ میری آنکھیں خون کے آنسو بہاتی ہیں!!

وہ خربوزوں کی آمد پر سبھی مسرور ہو جاتے!
وہ گرمی کے دنوں میں مختلف گھاٹوں پہ دریا کے!!
حسینوں کے پرے تفریح کی خاطر سے جاتے تھے!!!

شب مہتاب، دریا کا کنارا ریت کا بستر!
وہ پچھلی رات میں تاروں کی روپہلی حسیں چادر!!

وہ پنگھٹ اور وہ تالاب، وہ تاروں بھری راتیں!
وہ ساون کا مہینہ اور شباب آور وہ برساتیں!!
وہ مخلص، بے تکلف دوستوں کی پُر مذاق باتیں!!!

وہ پھر بناس[3] کے سینے پہ کشتی میں خوا خوری!
وہ طوفانوں کے ڈر سے پھر نکل آنا بہ مجبوری!!

---

[1] سید رحمٰن علی نقوی۔ بی۔ اے (علیگ)
[2] حبیب نور خان جوہر سیفی مرحوم (شہید جنگ)
[3] راجپوتانہ کے ایک مشہور دریا کا نام۔

وہ گلیاں جن میں کھولی تھیں محبت نے میری آنکھیں!
جہاں اکثر محبت کی ملا کرتی تھیں سوغاتیں!!
جہاں پروین سے ہوتی تھیں میری اکثر ملاقاتیں!!

وہ گلیاں اور وہ چوراہے وہ رستے یاد ہیں اب بھی
وہ رومانی ملاقاتیں، وہ نغمے یاد ہیں اب بھی!!

وہ باغیچے جہاں اکثر بہاروں نے جنم پایا!
جہاں جنت کے نظارے، جہاں فردوس کا سایا!!
ترانہ زندگی نے میری الفت کا جہاں گایا!!

جہاں پہ میری پروین مجھ سے ملنے کے لئے آتی!
وہ خود سرشار رہوتی اور مجھے سرشار کر جاتی!!

وہ اختر[1] اور بسمل[2] جیسے رومانی حسین شاعر!
وہ جوہر[3] اور سالک[4] جیسے قابل اور جوان شاعر!!

نہ بھولا تھا نہ بھولا ہوں، نہ بھولوں گا کبھی ان کو!
ازل سے جذبۂ شعری ملا مقسوم ہیں جن کو!!

---

[1] ادیب الملک اختر شیرانی۔
[2] شاعرِ محبت بسمل سعدی ہاشمی۔
[3] جوہر سعیدی ٹونکی
[4] سالک الہاشمی (علیگ)

وہ جنت کی بہاریں اب بھی اکثر یاد آتی ہیں!

وطن کی سمت سے آکر ہوائیں گیت گاتی ہیں!!

اور اک بچھڑے ہوئے کے واسطے پیغام لاتی ہیں!!!

تجھے تیرے وطن کی سرزمین اب یاد کرتی ہے

خدا کے واسطے آجا یہی فریاد کرتی ہے!

وطن کی سرزمین بے چین ہے تیرے لئے اب بھی!

وہاں کا ہر حسین بے چین ہے تیرے لئے اب بھی!!

بتری اختر بہین[1] بے چین ہے تیرے لئے اب بھی!!!

وہاں کھوئی ہوئی رہتی ہیں ساون کی بہاریں؟

وہاں بے کیف سی چلتی ہیں گلشن میں ہوائیں؟

---

[1] جسکے تصورات سے کاخ دل منور ہے

ع احمد۔ بی۔ اے (عثمانیہ)

"کھویا"

میں بنارس سے اکیلی حیدرآباد پہنچی۔ انہوں نے چلتے وقت مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوسری ٹرین سے نکل کر ایک دن بعد حیدرآباد پہنچ جائیں گے۔ رات بھر میں سوچتی رہی کہ اسطرح مجھے اکیلے بھیجتے انہیں کچھ تامل نہ ہوا۔ سینکڑوں اندیشے میری [illegible] [illegible] کو تیز کرتے رہے۔ فسٹ کلاس کے محفوظ ڈبے میں ہونے کے باوجود میں اپنے آپ کو غیر محفوظ اور بے چین پا رہی تھی۔ ایسا کیوں ہوا پھر میں نے اپنے دل کو تسکین دی کہ آخر وہ میرے پتی ہیں جیون سمبندھ ہو جانے کے بعد اسطرح کہیں ساتھ چھوٹ سکتا ہے۔ فاصلہ جیسے جیسے طے ہو رہا تھا ویسے ویسے میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ کہیں وہ نہ آسکے تو کیا ہوگا۔ کیا وہ سچ مچ اپنے ماں باپ اور دھن دولت میرے لئے تج کر دیں گے۔ ۔ کیوں نہ کریں گے ایسا۔ ایسا نہ کر سکتے تو اُن سب کی مرضی کے خلاف چپکے سے مجھے اپنی بیوی کیوں بنا لیتے۔ نہیں وہ ایسے نہیں ہیں میں نے خوب آزمایا انہیں۔ وہ بے وفا نہیں۔ میں بھی کیا ڈرپوک ہوں۔ یہ دل بھی کیا مجبور شئے ہے کیسے کیسے اندیشے پیدا کرتا ہے۔ محبت بھرے دلوں میں کہیں بدگمانیاں اسطرح جگہ لیتی ہیں۔ نہیں نہیں مجھے یوں نہ سوچنا چاہیئے۔ وہ رُک گئے ہیں۔ شاید کسی اہم کام سے آخر انہیں اپنی نئی زندگی کیلئے کچھ سرمایہ چاہیئے۔ شائد وہ نہ لے سکے ہوں۔ انہیں موقع نہ ملا ہو دولتمند ہیں پھر کاروبار اچانک کسطرح چھوڑ سکتے ہیں۔ وہ آئیں گے۔ ضرور آئیں گے ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ میں حیدرآباد پہونچونگی دوسرے دن وہ بھی پہونچ جائیں گے۔

اسی قسم کے خیالات کی کشمکش میں میں نے رات کاٹ دی۔ صبح صبح گاڑی حیدرآباد پہونچ گئی۔ میں نے قلی سے کہا کہ میرا سامان ٹیکسی موٹر میں رکھوا دے اور رائل ہوٹل پہنچانے کو کہدے۔ یہی پتہ انہوں نے دیا تھا مجھے۔

میں رائل ہوٹل کے ایک کمرہ میں ٹھہر گئی۔ ہوٹل کا مالک مجھے یکہ تنہا دیکھ کر متعجب تھا لیکن میری وجاہت اور ساز و سامان دیکھکر اسے جرات نہ ہوئی کہ وہ کچھ تفصیلات مجھ سے پوچھ سکے۔ جوں توں کر کے میں نے دن کاٹا۔ رات کو میری بے چینی اور بڑھ گئی۔ صبح اُن کے پہنچ جانے کا مجھے یقین نہ آتا تھا۔ دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر وہ آئے تو۔۔

وہ صبح کی گاڑی سے نہیں آئے۔ میرے اندیشے بڑھتے گئے۔ تین دن اور تین راتیں میں نے رو کر گذار دیں اب تو اُمید کا سہارا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ میں واپس چلی جاتی مگر اب بنارس اور حیدرآباد دونوں میرے لئے برابر تھے گھر سے اسطرح بھاگ نکلنے کے بعد پھر کیا منہ لیکر کوئی گھر جائے۔ میں نے سوچا اب تو سوائے خودکشی کے کوئی چارہ نہیں۔ محبت اور شادی کے بعد اتنا بڑا دھوکا کسی بدنصیب کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ اب جینے سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا۔

پونم کا چاند اپنی پوری بہار پر تھا۔ میں نے ٹھیک

شام کو نکلنے والی ٹرین کے وقت ٹیکسی منگوائی اور سامان ساتھ رکھ لیا ہوٹل کا بل چکا کر وہاں سے باہر نکلی راستہ میں میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ کیوں بھئی یہاں چاندنی میں لوگ تفریح کو کہاں جاتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا: بی بی جی گنڈی پیٹھ یہاں کی اچھی تفریح گاہ ہے۔ شہر سے دور خاموش اور پُر فضا ہے بس وہیں چلو......... ڈرائیور چونک پڑا۔ پر دیوی جی آپ تو......... میں نے کہا اس کوئی ہرج نہیں لوٹنے کے بعد میں ویٹنگ روم میں ٹھیر جاؤں گی مجھے تو صبح کی گاڑی سے جانا ہے......... میری بات ڈرائیور کے سمجھ میں نہیں آئی۔ پر وہ خاموش ہوگیا۔

گنڈی پیٹھ حیدرآباد سے ۱۲ میل پر ہے ٹیکسی کی رفتار کے ساتھ ساتھ میرے خیالات کی رفتار تیز ہو رہی تھی۔ اپکی میری ملاقات۔ معاشرہ مخالفتیں۔ پیار و محبت کے خطوط۔ ہمارے خفیہ شادی سب سلسلے سے میرے ذہن میں فلم کی طرح پھر رہے تھے۔ سوچ رہی تھی دنیا میں پریمی پر بھروسہ نہ کیا جائے تو کس پر کیا جائے کیا چاہنے اور بیاہنے والے ایسا دھوکہ دے سکتے ہیں۔ غصہ اور رنج کی اس کیفیت نے مجھے دیوانہ کردیا۔

میں گنڈی پیٹھ جا رہی تھی۔ ڈوب مرنے کے لئے میرے زیورات کے صندوقچے میں دس ہزار روپے کے زیورات تھے۔ میں نے سوچا۔ یہ اس آخر کا ہمراہی کے نذر ہوجائیں گے اسطرح میری خودکشی کا راز پوشیدہ رہ سکیگا۔ وہ میرا انتظار کرے گا۔ اور جب میں نہیں رہونگی تو یقیناً سمجھ جائیگا کہ میں نے خودکشی کرلی ہے وہ اتفاقاً ڈوب گئی۔ اس واقعہ کی اطلاع اگر وہ پولیس میں کرے تو گرفتار ہوجائے گا۔ اس کے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ وہ چپکے سے گھر جائے۔ اور اس واقعہ کو بھول جائے۔ میرے ذہن میں یہ خاکہ تھا۔

میں گنڈی پیٹھ پہنچ گئی۔ وہاں کی سہانی فضا مجھے ڈرا رہی تھی۔ موت کی دیوی میری ہستی پر چھا تی جا رہی تھی۔ مجھے اسکی باہیں کھلی ہوئی اور اس کا چہرہ مسکراتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں رات کے دو بجے وہاں پہنچی تھی۔ ۱۲ میل دور اس تفریح گاہ پر جو چھوٹی تھی پہاڑوں کی دامن میں خوبصورت جھیل کی طرح ہے رات کے دو بجے کون ہوسکتا ہے۔ چاروں طرف ہو کا سناٹا تھا۔ ہواؤں کی سنسنی خیز آوازیں میرے جسم میں خوف کی لہریں دوڑا رہی تھیں میں موٹر سے اُتر کر دور تک چلی گئی۔ چلتے چلتے میں ایک مقام پر پہنچی جو پتھروں اور ٹیلوں کے جھنڈ میں تھا۔ میں نے کچھ دور سے دیکھا کہ ایک شخص ایک چٹان پر خاموش اور اکیلا بیٹھا ہے۔ میں ڈری سہمی۔ مجھے ہلکا سا پسینہ آگیا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا اتنی رات گئے اس مقام پر کسی کا اسطرح بیٹھنا۔ ایسی بات ہے جو اپنے اندر ضرور کوئی راز پوشیدہ رکھتی ہے۔ [illegible] بیزار ہو کچھ ایسے ہی قبیل کے لوگ یہ حرکت کرسکتے ہیں۔ میں نے سوچا چلو اس بیتا کے مارے کا بھی حال پوچھ لیں یہ خیال آتے ہی میرے قدم اُسکی طرف اُٹھنے لگے۔ میں نے ایسا کیوں سوچی اور اُس اجنبی سے ملنے کی خواہش میرے دل میں کیوں پیدا ہوئی۔ میں نہیں بتا سکتی۔ میں نے کچھ فاصلہ سے اُسے آواز دی۔ کون ہے......... وہ جیسے چونکا۔ اُسے میرے وہاں پہنچنے کی خبر تک نہیں تھی۔ اس نے جواب دیا۔ تمہاری طرح ایک انسان۔ میں نے کہا اتنی رات گئے تنہا اس مقام کیوں بیٹھے ہو۔ کیوں یہاں آئے ہو تم۔ اُس نے جواب دیا تم کون ہو مجھ سے پوچھنے والی مجھے اپنے کاموں اور اپنی پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تمہیں۔ تم بھی اتنی رات گئے تنہا یہاں آئی ہو خاتون ہوکر اس وقت تنہا یہاں رہنا کیا حیرت ڈالنے والی بات نہیں۔ میں پوچھوں یہ کیوں کیا تم کیوں آئی ہو یہاں۔ میں اُس کے جواب سے سہم گئی میرا دل اُس کی طرف کھچا جا رہا تھا۔ اُس کے جواب میں اُسکے دل کی کیفیات اور اُس کے کردار کی خو [illegible]

سمجھ گئی کہ یہ ستم زدہ اور میری طرح زمانہ کا ستایا ہوا
ے ہمدردی اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میں
ں کے قریب گئی میں نے دیکھا کہ وہ نہایت ہی کم عمر
ر خوش رو نوجوان ہیں۔ قریب پہنچکر میں نے کہا
اف کرنا۔ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ اسطرح
م دونوں کی اسوقت یہاں موجودگی دونوں کے لئے
ستعجاب کا باعث ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ تعجب کی
ت نہیں میرے لئے ایسے واقعات نئے نہیں میری زندگی
یب وغریب واقعات ہی کی ایک داستان ہے مجھے
ب کوئی چیز انہونی نظر نہیں آتی۔ تمہیں اسطرح یہاں
یکھکر میں حیران نہیں ہوں۔ اس کے اس جواب سے
یں بھونچکا سی گئی میں اب اپنی پریشانیوں اور آنیوالی
ٹھوکریوں کے تصور سے ہٹکر اسکی ذات کے بارے میں
سوچنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے ڈرتے
ڈرتے اُس سے پوچھا کیا تم مجھے اپنے بارے میں کچھ
بتا سکتے ہو۔ اُس نے دردآمیز مسکراہٹ کے بعد جواب دیا
بہن۔ میری زندگی میں کچھ تھوڑا ہے۔ ایسی کوئی
شئے نہیں ہے۔ زندگی کے بارے میں نہ تو جانا جاسکتا ہے
اور نہ پوچھا جاسکتا ہے نہ اس میں کوئی پوچھنے کی بات ہے
اور نہ جواب دینے کی۔ اس دنیا کے رنگ و بو میں ابتدائے
آفرینش سے جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ ہو رہا ہے اور ہوتا رہیگا
آپ بھی ہماری طرح نہ معلوم کتنی زندگیاں اسوقت صفحۂ ہستی پر
بے چین نامراد اور ناکام ہوں گی۔ جس چیز پر ہمیں قابو
نہیں اُس کے بارے میں سوچنا سمجھنا۔ پریشان ہونا۔
خوش ہونا اور غم کھانا۔ بیوقوفی نہیں تو کیا ہے۔ زندگی تو
صرف سہے جانے کا نام ہے ایسی باتیں میرے کانوں میں
کاہے کو پڑی ہوں گی میں اُس کی باتوں میں کھو گئی۔
مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ اُس نے مجھے بہن
کہکر مخاطب کیا تھا۔ میں اس کے قدموں پر گر پڑی

زندگی کے اس خطرناک موڑ پر القدرت نے میرا ایک بھائی بھیجدیا۔
جس نے میری زندگی کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا۔
میں رونے لگی اُس نے مجھے تسلی دی اور کہا تمہارے ارادے
خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔ خودکشی آسان ہے۔ جینا مشکل
زندگی کی تلخیوں سے اسطرح بچ جانا۔ انسانیت کی تذلیل
ہے۔ اُن پر چھا جانا انسانیت کے وقار کو بڑھاتا ہے۔ ہم
ہارنے کیلئے پیدا نہیں ہوئے۔ ہمیں جینا ہے اور اسی سے
زندہ رہنا ہے۔ چلو میرے ساتھ میں تمہارے حال سے واقف
ہونا نہیں چاہتا۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ تم کون ہو۔ کہاں
سے آئی ہو۔ کیا کرنا چاہتی تھیں۔ چلو۔ بڑی خوش نصیب ہو
تم۔ ایسے مقام اور ایسی نعمتوں کے لئے چنی گئی ہو۔ جو
اپنی آپ نظیر ہیں میں تمہیں ایسی جگہ لیجاؤں گا جہاں دکھ
دکھ اور سکھ کو سکھ نہیں سمجھا جاتا۔ جہاں زندگی ایک خاموش
دریا کی طرح بہتی ہے۔ جہاں روحانی بلندیوں پر زندگیاں
متمکن ہیں۔ جہاں کچھ نہیں اور سب کچھ ہے۔ تم آئی نہیں ہو
لائی گئی ہو۔ مجھ سے لوگ ہوجاتے ہیں اور وہی تو یہ
آملے جو بھی آجاتا ہے اس سے تمہیں دیکھ کر مجھے تعجب
نہیں ہوا۔ میری زندگی ایسے ہی واقعات سے پر ہے قدرت
کو مجھ سے جو کام لینا تھا وہ لے رہی ہے اور پورا ہو رہا ہے
آؤ۔ بس اب چلو صبح ہو رہی ہے

میں عالم خود فراموشی میں مبہوت کھڑی اُسکی باتیں
سن رہی تھی۔ وہ آگے بڑھا میں اُس کے پیچھے ہوئی۔
موٹر تک پہنچکر اُس نے موٹر ڈرائیور کو ہدایتیں دیں اور خود
سیکل پر چل پڑا۔ اب میں سوچ میں پڑی کیا ماجرا ہے
یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ کون ہے یہ عجیب و غریب
ہستی کہاں لیجائے گا مجھے کیا مقام ہے وہ جہاں مجھے
رہنا ہوگا۔ کون ہے جسنے مجھے یہاں بھیجا۔ کیوں ہو رہا ہے
ایسا اور کیا ہوگا۔ دور شہر کے ایک چوراہے پر جاکر رک گئی
ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد وہ وہاں پہنچ گیا آہستہ آہستہ

ہم ایک صاف ستھرے محلے میں داخل ہوئے۔ جہاں عالیشان اور خوش وضع مکان چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ہم ایک عالیشان مکان میں داخل ہوئے۔ رات کے اس آخری حصے میں وہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیکن روشنی ہر کمرہ میں نظر آ رہی تھی۔ میں سہمی ہوئی اس کے ساتھ ہو گئی۔ میں نے سوچا خودکشی کرنے چلی تھی اور یہ کیا ہو گیا

بورڈنگ ہاؤس کی طرح اس عمارت میں کئی کمرے تھے وہ میرے ساتھ تھا۔ جب وہ اس بنگلے میں داخل ہوا تو ایک عجیب قسم کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا کہ کئی حسین لڑکیاں احترام اور محبت کے ملے جلے جذبے سے اُسے دیکھ رہی ہیں وہ سیدھا ایک کمرہ کی طرف بڑھا اُسکے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ کمرہ میں داخل ہو کر میں نے کیا دیکھا اُس کے بیان سے میری زبان قاصر ہے۔ میں ایک ایسی حسین و جمیل ہستی کے سامنے لائی گئی جو خیالی و مثالی دنیا کی ہو سکتی ہے۔ خطۂ ارضی پر تو ایسی حور دیکھنے میں نہ آئے گی۔ اُس کے حسن میں سوائے تقدس کے کچھ نہ تھا۔ میں خود بخود ادب اور خوف سے جھک گئی۔ اُس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ بہن تم خوش نصیب ہو۔ اس کے سوا اُس نے مجھ سے اور کچھ نہیں پوچھا۔ ہم کمرے سے باہر آئے لڑکیوں کے حسین جھرمٹ نے میرا استقبال کیا۔ ایک لڑکی نے نہایت محبت و پیار سے میرا ہاتھ پکڑا اُس کے ہاتھ میں اُس کے دلی جذبات کی گرمی تھی وہ جلدی سے مجھے ایک کمرہ کی طرف لے گئی جہاں آرام و آرائش کی پوری چیزیں تھیں۔ اس نے کہا بہن اب تم آرام کرو۔ صبح ملیں گے۔ میں کیا آرام کرتی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کروٹیں بدلتے وقت گذر گیا۔

جس آرام سے ہوں۔ عجیب و غریب ماحول میں کئی دن تک تو حیران و ششدر رہی کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا رات دیر گئے وہ کبھی کبھی آتا سب اُس کی منتظر رہتیں سب کے پاس آتا مگر باتیں کم کرتا۔ رفتہ رفتہ مجھے وہ سب حال معلوم ہوا جو میرے اس عجیب و غریب بھائی سے منسوب ہے، بنارس والوں کے حق میں میں مر چکی ہوں۔ ایسی جگہ ہوں جہاں سے میں مر کر نکلوں گی۔ مجھے زندگی کی دونوں دولتیں حاصل ہیں اس روحانی ماحول میں انسان زندگی کی عام سطح سے اونچے رہتے بستے ہیں۔ میری ساتھیوں میں اکثر شادی شدہ ہیں۔ لیکن سب ویسے ہی ہیں جیسے اس روحانی بستی کے رہنے والے۔ اب سب میرے بارے میں بھی سوچ رہی ہیں۔ سبکے ساتھ میں بھی اُس زندگی کی منتظر ہوں جو مجھ پر نازل ہو گئی۔ یہاں آنے والی گھڑیوں کے لئے کوئی بے چینی نہیں رہتا۔ ماضی۔ حال مستقبل۔ آج و کل زمان و مکان کی قید سے آزاد زندگی کٹ رہی ہے۔ میں سوچتی ہوں کیا اس ناؤ کا کھیوّیا یوں ہی مضطرب اور بے چین رہے گا کیا اُس کی قسمت میں پار لگانے کے سوا کچھ نہیں؟

شانِ تغزل

عثمان حامد

میری ہر سانس اب حامد پریشان ہوتی جاتی ہے
بنتا ہے صبح میری شام ہجراں ہوتی جاتی ہے

میرا غم پوچھنے والے خدا کی رحمتیں تجھ پر
مری حالت میرے رُخ سے نمایاں ہوتی جاتی ہے

معاذ اللہ وہ اُن کی چشم نوشیں کہہ نہیں سکتا
اُتر جاتی ہے جب دل میں تو پیکاں ہوتی جاتی ہے

نہیں جاتی مقدر کی پریشانی نہیں جاتی
میری قسمت تیری زلف پریشاں ہوتی جاتی ہے

عزیز زندگانی تھی کبھی حامد کہوں کیوں کر
وہ حسرت جو دردِ دل کا درماں ہوتی جاتی ہے

عیاں حیدری

ساقی

مجھ سا بھی رندِ بلانوش کہاں ہے ساقی / آسماں میرے لئے رطلِ گراں ہے ساقی
تجھکو کیا غم جو غمِ ہر دو جہاں ہے ساقی / دل جواں، روح جواں، عزم جواں ہے ساقی
گل فشاں، جامِ رواں، بادہ چکاں ہے ساقی / فرق سے تابقدم سحرِ جواں ہے ساقی
کیوں نہ پھر غرقِ مئے ناب گوارا کردوں / غم بھی منجملۂ اسبابِ جہاں ہے ساقی
طعنۂ کم نگہی دے نہ خراباتی کو / ہر نظر کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی
تلخیِ بادۂ گلرنگ گوارا ہے مجھے / تلخ تر اس سے غمِ کون و مکاں ہے ساقی
بزمِ بادہ ہے یہاں ذکرِ جہنم کیسا / سود نا محرمِ اسرارِ زیاں ہے ساقی
سلسلہ توڑ نہ اس دورِ بلانوشی کا / فرصتِ یک دو نفس دل پہ گراں ہے ساقی
ہاں یونہی اور بھی کچھ دیر سرِ بزمِ نشاط / نیچی نظروں پہ جنت کا گماں ہے ساقی
نالہ جز حسرتِ یک ساغرِ سرجوش نہیں / تشنگی حد سے جو گذرے تو فغاں ہے ساقی
تیرے جلوے بھی اہم بادۂ رنگیں بھی اہم / عشق بیچارہ کو فرصت ہی کہاں ہے ساقی
جام میں آئے جو ڈھل کر تو بنے خلدِ نظر / لب تک آئے تو یہی جانِ جہاں ہے ساقی
گھیر رکھا ہے زمانے کے حوادث نے مجھے / لا مرا ساغرِ گلرنگ کہاں ہے ساقی

غرقِ یک ساغرِ سرمستِ محبت کردے
تشنہ لب، تشنہ جگر تیرا عیاں ہے ساقی

قائم شدہ ۱۳۵۳ف

۱۲ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ

مجیدی کنفکشنرز

اعلیٰحضرت جلالت الملک نے بمراحم خسروانہ مجیدی کنفکشنرز کا لقب عطا فرماکر بورڈ پر شہزادہ کرنل نواب مکرم جاہ بہادر کی تصویر مبارک آویزاں کرنے کا جو شرف ہم کو بخشا ہے اسکی قدر و منزلت

محتاج تعارف نہیں

ضرورت کے وقت ہمیں نہ بھولئے

(روشندل محمد ریاض الدین کا کی شاہ نظامی)

مجیدی کنفکشنرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن

شاخ قریب درگاہ یوسفین بازار نامپلی

ہندوستانی لڑکی

ماں باپ کی نظروں میں

(عرفان) الہ آبادی

"مصیبت کا پیغام"

امام دُنیا سے قدامت پرستی ختم ہوگئی۔ لیکن نہ ختم ہوئی
دوستان سے یہاں اس بلیسویں صدی کے دَور میں بھی
ا پرستیاں۔ فضول رسومات اور خود اختیار کردہ اصول
وہ سینکڑوں تباہ کن اثرات کا دَور دورہ ہے۔
ستانی انگریز کے غلام ہیں۔ ہندوستانی رسومات کے
ہیں۔ ہندوستانی بدعت پرستی کے غلام ہیں۔ غرض
ود اپنی ہی زنجیروں میں آپ جکڑے ہوئے ہیں۔ اور
لے غلام کون ہیں؟ ان کی اولادیں۔ خود اختیار کردہ
ماری کے اصولوں کو شریعت کا نقلی جامہ پہنا کر یہ
ت پرست لوگ اب تک اپنی مرضی اپنی خوشی اپنی
، اور اپنی ناک پر اپنی سینکڑوں بلکہ۔ لاکھوں بے گناہ
دوں کی مسرتیں۔ ان کی تمناؤں اور ان کی زندگیوں کی
ٹ چڑھا رہے ہیں۔ اور اسی کا نام رکھ لیا ہے فرض۔
خیر آج کل کے نوجوان لڑکوں میں تو کسی حد تک بیداری
ب لہر پیدا ہو چکی ہے اور وہ اپنے حقوق کو پہچاننے لگے
۔ لیکن ہندوستان کی بے زبان لڑکیاں اب بھی "بھینٹ
بریوں" کی طرح اس مسلسل غلامی کی چھری تلے دبی
سسک رہی ہیں۔ ان کے لئے قدم قدم پر قیود ہیں۔ بات
پر جھڑکیاں ہیں۔ ذرا ذرا سی غلطیوں پر ٹوٹتے ہیں۔
مات کی غلامی نے۔ اور قدامت پرستی کے بھوت نے
لُہنہ دماغ والدین کے دماغ اس قدر خراب کر رکھے ہیں
ہ اپنی اولادوں کا خود ہی گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ جیسے

ایک مصیبت ہو انکے لئے۔

جوان بیٹی۔ ماں باپ کا بخار ہوا کرتی ہے جس پر ہر وقت نزلہ گرتا رہتا ہے۔ اٹھی تو اٹھی کیوں۔ بیٹھی تو بیٹھی کیوں۔ ہنسی تو کیوں ہنسی۔ غرضیکہ ہر ہر طرح اس پر ایسی قیود لگا دی جاتی ہیں کہ زندگی حرام ہو جاتی ہے اس کی۔

محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اور اگر کہیں اتفاق سے کسی قدامت پرست گھرانے کی کوئی لڑکی کسی سے دل لگا بیٹھی۔ تو والدین کی نظروں میں یہ اتنا بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے جسے شاید خدا بھی معاف نہ کر سکے۔ حالانکہ محبت خود خدا کی محبوب ہے۔ اس غریب کی زندگی کانٹوں میں اُلجھا دی جاتی ہے۔ اس پر طرح طرح کی سختیاں کی جاتی ہیں۔ کہیں گلا گھونٹنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ اور کہیں گولی مار دینے کی۔ گویا وہ اولاد کی موت وزندگی تک کے مختار ہیں۔ وہ اپنی خود مختاری کے زعم میں اپنے فرض کے آگے اولاد کی تمام مسرتوں کا خون کر دیتے ہیں۔ گویا نہ اس کے سینے میں دل ہے نہ دل میں ارمان اور ہے بھی تو کیا ہوا۔ ماں باپ کی مرضی بڑی چیز ہے۔

ہاں تو۔ مختصر یہ کہ خونخوار تہذیب کی یہ گندی لعنت صرف ہندوستانی ماں باپ کے حصے میں ہی رہ گئی ہے۔ جس کی تباہ کاریاں ہم روزانہ اَن گنت تعداد میں دیکھتے ہیں۔ مگر سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ایسی تہذیب کو بدل دینے کا احساس نہیں کرتے۔ ذیل کا افسانہ بھی اسی خونی سرخی

بیٹی پر جوانی آئی اور ماں باپ پر بخار چڑھ آیا۔ اس طرح
چھپا کر رکھو کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ ورنہ ہوا لگ جائے گی۔
اب فکر ہونے لگی ایک ڈائنڑ کی۔ یا ایک داماد کی۔ لیکن
اس بے زبان سے اس قدر بھی نہ پوچھا گیا کہ تجھے فلاں قصائی پسند
ہے یا نہیں۔ مطلب یہ کہ شادی تو لڑکی کی اور پسند ماں باپ کی
عمر ساری گزارنا تھا بیچاری لڑکی کو اور اس کا شریک زندگی
چنیں ماں باپ خواہ اس جوڑے کی فطرتیں آپس میں متضاد
ہی کیوں نہ ہوں ــ
بہر حال ابھی ماں باپ اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھے
کہ دوسری طرف قسمت اور قدرت نے اپنے بازو وسیع کرنا
شروع کئے۔

بغل والے مکان میں کوئی شاہجہاں خانصاحب کرایہ پر
رہتے تھے۔ ان کا ایک ۲۲ سالہ لڑکا تھا۔ جمیل بہت
شریف اور سلیم الطبع۔ ابھی وہ کالج ہی میں تعلیم پا رہا تھا
کہ خانصاحب کا تبادلہ کسی دوسرے شہر کو ہو گیا۔ مگر جمیل
کو اپنی تعلیم کی وجہ سے وہیں رک جانا پڑا۔
خانصاحب کے گھر سے مرزا صاحب کے گھر والوں کے
اچھے تعلقات تھے۔ گو دراز نہیں لیکن پر خلوص۔ دونوں
گھروں کی عورتیں اکثر ایک دوسرے کے یہاں مہمان چلی جایا
کرتیں۔ جمیل دن بھر کالج میں رہتا اور شام کو کلب میں۔ اُس
کا زیادہ تر وقت باہر ہی گزرتا تھا۔
مرزا صاحب کی دختر۔ پروین بھی ماشاءاللہ اب جوان
ہو چکی تھی۔ مگر خانصاحب تھے انتہائی قدامت پرست۔
تھوڑی سی تعلیم دلا کر لڑکی کا پردہ کروا دیا تھا۔ اور وہ بھی اپنا
گھر اکر گھر کے در و دیوار کے سوا کبھی کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔
پروین کی ماں اکثر پڑوس میں خانصاحب کی بیوی سے
ملنے چلی جاتیں۔ اور وہ بیچاری اکیلی پڑی پڑی گھبرا جاتی
جیسے اُسے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ ایک چھوٹا بھائی
تھا سو وہ بھی زیادہ تر بیمار ہی رہتا۔
ایک دن پردیس سے پروین کے ماموں مہمان آئے
انہیں سلام کرتے وقت کہیں پروین خوشی سے ہنس دی
بس مرزا جی بگڑ گئے بری طرح
"نہ شرم رہ گئی ہے نہ حیا۔ آج کل کی لڑکیوں میں۔
کتنی بیباک ہوتی جا رہی ہے یہ لڑکی۔" وہ دانت پیستے
ہوئے بولے۔
"اے ہے۔ یہ کیا لچھن ہیں تیرے۔ مردار۔ بے حیا
ہنستی ہے۔"
ماں بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملا کر بول اُٹھی۔

بیچاری پروین۔ اداس ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور
تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔
ماموں کے آنے سے خوش ہوئی تھی مسکرا اُٹھی۔
کوئی گناہ تھا۔ ہنسنا رونا بھی حرام ہے۔
وہ سوچنے لگی کہ آخر ایسے گھر میں پیدا ہی کیوں ہو
نہ جینے کی اجازت ہے نہ مرنے کی۔

اُسی دن شام کو کہیں نیچے سے کسی کی بارات گزر
رہی۔ پروین بھی باجے کا شور سن کر کوٹھے پر چڑھ گئی
گزرتی ہوئی بارات کو دیکھنے لگی۔ اس کی ماں نیچے
میں تھی۔ پروین بارات کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اُس
بغل والے مکان کے کوٹھے پر کھڑے ہوئے جمیل
دیکھا۔ جمیل بھی اتفاقیہ طور پر۔ گرمی زیادہ ہونے
سے۔ آج کوٹھے پر کرسی ڈال کر بیٹھا کتاب پڑھ رہا
بارات گزر گئی۔ پروین پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ
اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُسے دیکھ رہا۔

نہ جانے کیوں خود اس کی نظریں بھی جمیل کی طرف اٹھ گئیں
دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور ایک لمحہ کے لئے سکتے کے
عالم میں وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اب ہی آپ
شرم سے پروین کا چہرہ گلنار ہو گیا اور وہ گھبرا کر نیچے اتر
گئی۔

دو تین دن تک وہ کوٹھے پر نہ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ
اس اتفاق کو بھول جائے۔ مگر نہ جانے کیوں بار بار وہ منظر
یاد آتا اور اس کا معصوم دل سینے میں دھڑکنے لگتا۔
جمیل کی تصویر جیسے اس کی نظروں میں کھچ گئی ہو۔ اس
نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے اس خیال سے اپنے
کو دور رکھنے کی کوشش کی لیکن نہ کر سکی اور چوتھے دن
جب وہ ڈرتے ڈرتے اوپر چڑھی۔ تو سر اٹھاتے ہی اس
کی نظریں جمیل سے ٹکرا گئیں۔ دوسرے والی چھت پر
جمیل ہی کھڑا تھا۔ شاید وہ [illegible] پروین کو
دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا [illegible] وہ
اسی طرح کھوئے رہے۔ پھر پروین [illegible] نیچے اتر آئی۔
اب اسی طرح روز وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔
بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس قدر قریب ہو گئے کہ درمیان میں صرف
دیوار کی آڑ رہ گئی۔ ایک دن تو جمیل نے ایک خط بھی اس
کی طرف پھینک دیا۔ [illegible] تمہارے بغیر
مجھے یہ زندگی [illegible] نہیں
دیکھ لینا۔ مجھے [illegible] کیا کر دیا
ہے تم نے ——— پروین اس خط کو پڑھ کر کھل اٹھی۔
اس کا دل محبت کا بھوکا تھا۔ ایک [illegible] اور پاک
محبت جو غیر فانی ہو ——— اور وہ اسے مل گیا۔ اور
اس نے بھی ایک دن ہمت کر کے جواب لکھ دیا کہ "یہی
حال میرا ہے۔"
اس اظہار محبت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت ہی عشق
کا رنگ اختیار کرتی گئی۔ اور وہ اب ایک دوسرے کے
لئے دیوانے سے رہنے لگے۔ ایک دن شام کے دھندلکے
میں پروین جب چاندنی پر پہنچی تو اس طرف سے جمیل بھی
دیوار کے قریب آ گیا۔
"آج بڑی دیر سے آئے میرے حضور" جمیل نے
آہستہ سے پوچھا۔ "امی کے ساتھ کام کر رہی تھی"
وہ مختصراً بولی۔
"تو اسی کام میں اپنے دیوانے کو بھول گئیں یہی نا"
جمیل نے مسکرا کر کہا۔
"جی نہیں۔ بھلا آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں" وہ
جذبات میں کہہ گئی۔ مگر فوراً بعد ہی کسی نے پشت
سے اس کے بال تھام لئے۔ یہ اس کی ماں تھی۔
"کیوں ری چڑیل" وہ غضبناک انداز میں چیخیں
جمیل وہاں سے [illegible]۔
اس رات پروین کی ماں نے [illegible]
کہہ دیا۔ [illegible] بیچاری کا برا حال ہو گیا۔ باپ کے آتے
ہی انہیں بھی خبر کر دی گئی اور وہ بغیر سوچے سمجھے
ایک زور کا تھپڑ لگاتے ہوئے گرج پڑے۔
"بے غیرت۔ کمینی۔ میرے خاندان کی عزت خاک
میں ملائے گی۔ بے حیا۔ مر کیوں نہ گئی پیدا ہوتے ہی۔
ننگ کنی پر خدا کا قہر ٹوٹے۔" گویا اس نے بہت
بڑا گناہ کیا تھا۔ جسے ان قدامت پرستوں کا مذہب اور
خدا بھی معاف نہ کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک ایک
لڑکی کی زندگی۔ صرف چہار دیواری میں گھٹ گھٹ کر
دم توڑ دینے ہی پر موقوف تھی۔ گویا وہ صرف ماں باپ
کی ہر مرضی پر بھینٹ چڑھنے کے لئے پیدا ہوئی تھی
——— بے زبان قربانی ——— جس کی موت
زیست کی عنان اختیار۔ ان ہی خود پرست ماں باپ
کے ہاتھوں میں تھی۔
اسی پر اکتفا نہیں کی گئی۔ بلکہ اس دن سے اس

کا پس منظر ہے۔

بیٹی پر جوانی آئی اور ماں باپ پر بخار چڑھ آیا۔ اس طرح چھپا کر رکھو کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ ورنہ ہوا لگ جائے گی۔

اب فکر ہونے لگی ایک ڈاکٹر کی۔ یا ایک داماد کی۔ لیکن اس بے زبان سے اس قدر بھی نہ پوچھا گیا کہ تجھے فلاں قصائی پسند ہے یا نہیں۔ مطلب یہ کہ شادی تو لڑکی کی اور پسند ماں باپ کی عمر ساری گزارنا تھا بیچاری لڑکی کو اور اس کا شریک زندگی چنیں ماں باپ خواہ اس جوڑے کی فطرتیں آپس میں متضاد ہی کیوں نہ ہوں۔

بہرحال ابھی ماں باپ اسی اُدھیڑ بن میں مبتلا تھے کہ دوسری طرف قسمت اور قدرت نے اپنے بازو وسیع کرنا شروع کئے۔

بغل والے مکان میں کوئی شاہجہاں خانصاحب کرایہ پر رہتے تھے۔ ان کا ایک ۲۲ سالہ لڑکا تھا۔ جمیل بہت شریف اور سلیم الطبع۔ ابھی وہ کالج ہی میں تعلیم پا رہا تھا کہ خانصاحب کا تبادلہ کسی دوسرے شہر کو ہو گیا۔ مگر جمیل کو اپنی تعلیم کی وجہ سے وہیں رُک جانا پڑا۔

خانصاحب کے گھر سے مرزا صاحب کے گھر والوں کے اچھے تعلقات تھے۔ گو دراز نہیں لیکن پرخلوص۔ دونوں گھروں کی عورتیں اکثر ایک دوسرے کے یہاں مہمان چلی جایا کرتیں۔ جمیل دن بھر کالج میں رہتا اور شام کو کلب میں اُس کا زیادہ تر وقت باہر ہی گزرتا تھا۔

مرزا صاحب کی دختر۔ پروین بھی ماشاءاللہ اب جوان ہو چکی تھی۔ مگر خانصاحب تھے انتہائی قدامت پرست۔ تھوڑی سی تعلیم دلا کر لڑکی کا پردہ کروا دیا تھا۔ اور وہ بھی اپنا گھرا کر گھر کے در و دیوار کے سوا کبھی کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔

پروین کی ماں اکثر پڑوس میں خانصاحب کی بیوی سے ملنے چلی جاتیں۔ اور وہ بیچاری اکیلی پڑی پڑی گھبرایا کرتی جیسے اُسے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ ایک چھوٹا بھائی تھا سو وہ بھی زیادہ تر بیمار ہی رہتا۔

ایک دن پردیس سے پروین کے ماموں مہمان آئے انہیں سلام کرتے وقت کہیں پروین خوشی سے ہنس دی بس مرزا جی بگڑ گئے بُری طرح

" نہ شرم رہ گئی ہے نہ حیا۔ آج کل کی لڑکیوں میں۔ کتنی بیباک ہوتی جا رہی ہے یہ لڑکی۔" وہ ڈانٹتے ہوئے بولے۔

" اے ہے۔ یہ کیا لچھن ہیں تیرے۔ مُردار۔ بے حیا ہنستی ہے۔"

ماں بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملا کر بول اُٹھی۔

بیچاری پروین۔ اداس ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

ماموں کے آنے سے خوش ہوئی تھی مسکرا اُٹھی۔ کوئی گناہ تھا۔ ہنسنا رونا بھی حرام ہے۔

وہ سوچنے لگی کہ آخر ایسے گھر میں پیدا ہی کیوں ہو۔ نہ جینے کی اجازت ہے نہ مرنے کی۔

اُسی دن شام کو کہیں نیچے سے کسی کی بارات گزری۔ پروین بھی باجے کا شور سن کر کوٹھے پر چڑھ گئی اور گزرتی ہوئی بارات کو دیکھنے لگی۔ اس کی ماں نیچے میں تھی۔ پروین بارات کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اُس نے بغل والے مکان کے کوٹھے پر کھڑے ہوئے جمیل کو نہ دیکھا۔ جمیل بھی اتفاقیہ طور پر۔ گرمی زیادہ ہونے سے۔ آج کوٹھے پر کرسی ڈال کر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ بارات گزر گئی۔ پروین پلٹنا ہی چاہتی تھی کہ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُسے دیکھ رہا ہے

جانے کیوں خود اُس کی نظریں بھی جمیل کی طرف اٹھ گئیں دونوں کی نظریں ٹکرا گئیں اور ایک لمحہ کے لئے سکتے کے عالم میں وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنے آپ شرم سے پروین کا چہرہ گلنار ہو گیا اور وہ گھبرا کر نیچے اتر آئی۔

دو تین دن تک وہ کوٹھے پر نہ گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس اتفاق کو بھول جائے۔ مگر نہ جانے کیوں بار بار وہ منظر یاد آتا اور اُس کا معصوم دل سینے میں دھڑکنے لگتا۔ جمیل کی تصویر جیسے اس کی نظروں میں کھچ گئی ہو۔ اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے اس خیال سے اپنے کو دُور رکھنے کی کوشش کی لیکن نہ کر سکی اور چوتھے دن جب وہ ڈرتے ڈرتے اوپر چڑھی۔ تو سر اٹھاتے ہی اس کی نظریں جمیل سے ٹکرا گئیں۔ دوسری طرف والی چھت پر جمیل کھڑا تھا۔ شاید وہ [illegible] پروین کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا [illegible] وہ اسی طرح کھوئے رہے۔ پھر پروین جھجک کر نیچے اتر آئی۔

اب اسی طرح روز وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس قدر قریب ہو گئے کہ درمیان میں صرف دیوار کی آڑ رہ گئی۔ ایک دن تو جمیل نے ایک خط بھی اس کی طرف پھینک [illegible] تمہارے بغیر مجھے زندگی بوجھ [illegible] نہیں دیکھ لیتا۔ مجھے [illegible] کیا کر دیا ہے تم نے ——— پروین اس خط کو پڑھ کر کھل اٹھی۔ اُس کا دل محبت کا بھوکا تھا۔ ایک [illegible] محبت جو غیر فانی ہو ——— اور وہ اسے مل گیا۔ اور اُس نے بھی ایک دن ہمت کر کے جو یہ لکھ دیا کہ "یہی حال میرا ہے"

اس اظہار محبت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت نے عشق کا رنگ اختیار کر لی گئی۔ اور وہ اب ایک دوسرے کے لئے دیوانے سے رہنے لگے۔ ایک دن شام کے دھندلکے میں پروین جب چاندنی پر پہنچی تو اس طرف سے جمیل بھی دیوار کے قریب آ گیا۔

"آج بڑی دیر سے آئے میرے حضور" جمیل نے آہستہ سے پوچھا۔ "امی کے ساتھ کام کر رہی تھی" وہ مسکرا کر بولی۔

"تو امی کے کام میں اپنے دیوانے کو بھول گئیں یہی نا" جمیل نے مسکرا کر کہا۔

"جی نہیں۔ بھلا آپ کو کیسے بھول سکتی ہوں" وہ جذبات میں کہہ گئی۔ مگر فوراً بعد ہی کسی نے پشت سے اس کے بال تھام لئے۔ یہ اس کی ماں تھی۔

"کیوں ری چڑیل" وہ غضبناک انداز میں چیخیں جمیل وہاں سے سر پٹ بھاگ گیا۔

اس رات پروین کی ماں نے [illegible] کر دی وہ بے چاری کا برا حال ہو گیا۔ باپ کے آتے ہی انہیں بھی خبر کر دی گئی اور وہ بغیر سوچے سمجھے ایک زور کا تھپڑ لگاتے ہوئے گرج پڑے۔

"بے غیرت۔ کمینی۔ میرے خاندان کی عزت خاک میں ملائے گی۔ بے حیا۔ مر کیوں نہ گئی پیدا ہوتے ہی۔ تک کٹی پر خدا کا قہر ٹوٹے۔ گویا اس نے سب سے بڑا گناہ کیا تھا۔ جسے ان دو مست پرستوں کا مذہب اور خدا بھی معاف نہ کر سکتا تھا۔ ان کے نزدیک ایک لڑکی کی زندگی۔ صرف چہار دیواری میں گھٹ گھٹ کے دم توڑ دینے ہی پر موقوف تھی۔ گویا وہ صرف ماں باپ کی ہر مرضی پر بھینٹ چڑھنے کے لئے پیدا ہوئی تھی ——— بے زبان قربانی ——— جس کی موت زیست کی عنان اختیار۔ ان ہی خود پرست ماں باپ کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔

اسی پر اکتفا نہیں کی گئی۔ بلکہ اس دن سے اُس

کڑی نگرانی رکھی جانے لگی۔ کبھی بھول کر اگر کوٹھے کے
زینے کے پاس سے گذر بھی گئی تو طعنوں کی بوچھار سے
اسکا سینہ چھید ڈالا گیا۔

"چین نہ پڑا۔ چلی پھر ادھر" بے حیا بی بی دم کی خیر۔
چڑیل کہیں کی۔ ہڈی پسلیاں توڑ ڈالوں گی۔ ہائے
غضب۔ جیسے دیدوں کا پانی مرگیا ہے۔ آج کل کی لڑکیوں
کا۔ آخر ہم پر بھی نوجوانی آئی تھی کبھی۔ خدا نہ کرے جو ایسی
بے حیائی کی ہو۔ کیوں اپنی عاقبت خراب کرتی ہے مالزادی"
یہ تھے شریف رسم پرست خاندانوں کے معزز ماں
باپ کے الفاظ۔

یہ تو اظہر من الشمس تھا کہ۔ جمیل ٹھیرا پٹھان زادہ۔
اور پروین کا گھرانا سیدوں کا تھا۔ پھر کس طرح ان دو
مختلف المذاہب خاندانوں میں شادی ہوسکتی تھی۔
مسلمان تھے تو کیا ہوا۔ ان کا مذہب تو یہ نہ سکھاتا تھا
کہ آپس میں شادیاں بھی کرلو۔ باپ دادا مرگئے مگر کبھی
کسی غیر خاندان یا دوسری ہڈی میں شادی نہ کی۔ پھر
بھلا بزرگوں کے چہرے پر خاک کون مل سکتا۔

میر صاحب نے جلد از جلد بیٹی کے لئے خاندان کا ایک
لڑکا چن لیا۔ ماشاء اللہ چھ درجے پڑھا ہوا۔ بیکار تھا
تو کیا ہوا۔ تھا تو خاندان کا۔ رہا شطرنج بازی اور بازار گردی
کا شوق۔ تو یہ تو نوجوانوں کا مشغلہ ہے۔ جہاں شادی ہوئی
ٹھیک ہو گیا۔ چنانچہ اسی خیال سے یہ رشتہ طے کر دیا
گیا۔ پروین کو جب خبر ہوئی تو فرط غم سے اس کا برا حال
ہو گیا۔ وہ نڈھال ہو کر گر پڑی۔ جیسے ظلمات کے اندھیرے
[illegible] ہوا۔ [illegible] اچانک [illegible] گر پڑے۔
[illegible]

گر رہی تھیں۔ اور اس کے پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ
اپنی موت کو اپنی آنکھوں میں رقصاں دیکھ رہی تھی۔
مگر مجبور تھی۔ اس لئے کہ ہندوستان کے ایک قدامت پرست
مسلم خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ نہیں چشم و چراغ
نہیں۔ بلکہ مصیبت۔ ایسی مصیبت جسے اس کے
والدین جلد از جلد اپنے سر سے دور پھینکنا چاہتے تھے۔
بلکہ ان کا بس چلتا تو ایسی مصیبت کا گلا گھونٹنے میں بھی
دریغ نہ کرتے۔ نہ جانے غریب جمیل کا کیا حال تھا۔
خدا سے دعائیں مانگتے مانگتے جب بہت دن گزر گئے
تو ایک دن اتفاق سے اسے جمیل کا خط ملا۔ یہ ایک
کمسن لڑکا اندر آکر چپکے سے اسے دے گیا تھا۔
اس میں جمیل نے لکھا تھا کہ۔ تمام واقعات اسے معلوم
ہو چکے ہیں اور پروین کو کھو دینے کے غم نے اسے بستر
پہ ڈال دیا ہے۔ نہ جانے کیا حال ہو آگے۔ چاہتا تو
بہت کچھ کر سکتا تھا۔ مگر مجبور ہوں۔ کہ تمہارے والدین
کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے سے تمہاری بدنامی ہوگی۔
کاش کہ میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہوں ——
خط پڑھ کر پروین کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ جانتی
تھی کہ جمیل اس سے بے حد محبت کرتا ہے۔
خدانخواستہ دیوانگی میں کچھ کر نہ بیٹھے۔ گھبرا کر اس نے
اسی وقت اسے جواب لکھا کہ۔ خدارا ایسی ہمت
نہ چھوڑیئے۔ اگر پروین کے لئے آپ جان قربان کر سکتے
ہیں۔ تو پروین بھی محبت کی قدر جانتی ہے۔ وہ کسی اور
کی ہونے سے پہلے ہی سب کچھ چھوڑ چکی ہوگی —— یقین
مانئے۔ میں آپ کی تھی اور آپ کی ہوں۔ اور آپ کی ہی
رہوں گی۔ آپ کو میری قسم جنون میں کچھ کر نہ بیٹھنے گا [illegible]

آپ کی پروین

[illegible] لڑکا پھر آیا اور خط لے گیا۔ مگر جب وہ گھر [illegible]
[illegible]
[illegible] اتفاق سے [illegible]

ایک طمانچہ مار کر اُس سے وہ خط چھین لیا۔ بزرگوں کی عقل بھی بزرگ۔ وہ اس خط کا کچھ اور ہی مطلب سمجھ بیٹھے۔ اپنی بیگم سے بولے۔

"سمجھتی ہو۔ تمہاری بیٹی کیا گُل کھلانے والی ہے۔"

"کیا؟" بیگم نے پوچھا۔

"اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نکل بھاگے گی بے حیا۔ بے غیرت۔"

"ہائے اللہ۔ اتنی ہمت۔ ارے یہ مر کیوں نہ گئی پیدا ہوتے ہی۔ سارے خاندان میں تھو تھو مچ جائے گی۔ ہم تو کہیں کے نہ رہیں گے۔"

"ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس بے حیا کو ایسا کرنے سے پہلے ہی مار ڈالوں گا۔"

"الٹی سیدھی باتیں نہ کریئے۔ کل بارات آنے والی ہے۔"

"آنے دو۔ دیکھا جائے گا۔" میر صاحب دانت پیستے ہوئے بولے۔ لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے پروین سے کچھ نہ کہا۔

دوسرے دن صبح سے ہی تمام انتظامات شروع ہوگئے۔ آج بارات آنے والی تھی نا۔ مگر میر صاحب کا چہرہ نہ جانے کیوں صبح سے دمکا ہوا تھا۔ وہ بہت غضبناک تھے اور ان کی نظریں بار بار پروین کو گھور رہی تھیں۔ آخر نہ رہا گیا تو پروین کے پاس پہنچے۔ وہ سر جھکائے تنہا بیٹھی تھی۔

"پروین میں جانتا ہوں تو کیا کرنے والی ہے ... مگر وہ نہیں ہو سکتا۔" وہ گرج کر بولے۔ پروین حیرت سے ان کی صورت دیکھنے لگی۔

"آج میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ نام و ناموس پر بڑی سے بڑی قربانی دی جا سکتی ہے .... لے آج میں تجھے کچھ دے رہا ہوں۔ اسے پی لے ..."

زرد رنگ کے پانی سے بھرا ہوا گلاس پروین کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"تیرا یہی ایک علاج ہے۔ تیرے اعمال بد کی سزا۔ بے حیا کہیں کی۔" میر صاحب نے کہا۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ پروین سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور گلاس اٹھا کر پی گئی۔ میر صاحب کا سر چکرا گیا اور ٹانگیں لڑکھڑا کر گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔

شام ہوتے ہوتے جس وقت پروین کی سہیلیاں اس کے پاس پہنچیں تو پروین کا مردہ جسم پھولوں میں مرجھایا ہوا پڑا ہوا تھا۔ مگر اس سے قبل ہی پشت والے مکان سے رونے کی صدائیں بلند ہو چکی تھیں۔ لوگ جمیل کا ماتم کر رہے تھے۔ اور میر صاحب۔ اپنی اس مصیبت کا۔ جس کا آج خاتمہ ہو چکا تھا۔

نصیرؔ مہوی

"جوانی کے دوزخ"

[illegible] دورِ خزاں کا ایک طرف اور جشنِ بہاراں ایک طرف
چھائی ہوئی محفل ایک طرف اور دولت کے ساماں ایک طرف

اب کس کی صدا پر جھکتی ہیں "اربابِ محبت" کی نظریں!
ہے داغِ جوانی ایک طرف . وہ ماہِ درخشاں ایک طرف

[illegible] کشمکشِ ہنگامِ وفا ؟ جینا بھی قیامت ہے اپنا
[illegible] کا پیرِ پریشاں ایک طرف اور حسن کے احساں ایک طرف

اب کس کا سہارا ڈھونڈیں ہم اور کس کے کرم کو روئیں ہم؟
ہے عمرِ گریزاں ایک طرف ، اور گردشِ دوراں ایک طرف

[illegible] ہم کہیں ، کو توڑ بھی دو "امید کے رشتے" جو بھی ہو
[illegible] ہم بھی پریشاں ایک طرف ، تم بھی ہو ہراساں ایک طرف

اے "زمانہ ویراں" ؟ تو ہی بتا اب کیا ہے "سبیلِ آبادی"
خوددارِ محبت ایک طرف "روٹھا ہوا مہماں" ایک طرف

[illegible] ریاستِ جوانی کو کیوں کر مل جائے "سکون" و "آزادی"
"حد بندیِ ارماں" ایک طرف جذبات کا طوفاں ایک طرف

اے "جوشِ تمنا" یہ تو بتا ؟ انجامِ کشاکش کیا ہوگا۔
"آدابِ محبت" ایک طرف "مچلے ہوئے ارماں" ایک طرف

بیدرد زمانے کی نظریں بدلی ہیں نصیرؔ اس جرأت پر
ہم "دامنِ غم" میں چھپ کر کیوں بیٹھے رہے شاداں ایک طرف

مشاعرہ اور نصابِ تعلیم

عطاء جدانی
(علیگ)

تعلیم کا یہ مسلم اصول ہے کہ کسی علم یا فن کی تدریس کے لئے طلباء کو پہلے اس کے اسباق اور مضمرات کی توضیحات کے ساتھ تعلیم دی جاتی ہے۔ نفس مضمون کی تفہیم کرائی جاتی ہے اور بشرط ضرورت عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ طرح طرح کے تمثیلی، استخراجی اور بیانی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور طرزِ تدریس کے دُہرانے کو روا رکھا جاتا ہے۔ ایک مدت معینہ کے بعد طلباء کا امتحان لیا جاتا ہے۔ امتحان کے لئے چند فی صد نشانات مقرر ہوتے ہیں۔ اگر طلبا امتحان کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں تو سمجھا جاتا ہے کہ تعلیم کا نصب العین حاصل ہو رہا ہے۔ مثلاً ہم زبان و ادب کے طلباء کو حروف و الفاظ کی تعلیم کے بعد جملے لکھنا سکھاتے ہیں اور اس کے بعد عبارت آرائی یعنی کمپوزیشن کی عملی تعلیم دیتے ہیں۔ جملوں کی ترتیب بتاتے ہیں۔ الفاظ کی صرفی نوعیت پر بحث کرتے ہیں لفظوں کا ایک دوسرے سے تعلق اور محل استعمال سکھاتے ہیں۔ جملوں سے نحوی بحث کرتے ہیں اور ان کا ربط بتلاتے ہیں۔ مافی الضمیر اور تخیلات کے اظہار کے لئے عبارت میں جامعیت اور وضاحت پیدا کرنا سکھاتے ہیں۔ اور اسی کو صرف و نحو یا قواعد زبان کہتے ہیں۔ صرف و نحو کی اس ابتدائی اور اصولی کی تعلیم کے بعد امتحان لیا جاتا ہے۔ طلباء سے عبارت لکھوائی جاتی ہے، مضمون لکھوایا جاتا ہے اور تحلیل صرفی و تجزیہ نحوی کرایا جاتا ہے۔ لیکن نثر کے برخلاف نظم میں ہم کوئی عملی تعلیم نہیں دیتے لیکن بذریعہ تقطیع امتحان لیتے ہیں یعنی ہم نثر تو لکھنا سکھاتے ہیں لیکن شعر لکھنا نہیں سکھاتے محض شعر لکھنے کے اصول پڑھاتے ہیں اور امتحان لیتے ہیں شعر گوئی کی صحت کا! شعر کی تفہیم کا اور اس کے اصولوں کا

اگر علم عروض پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بلحا[ظ] نوعیت و باعتبار موضوع لہٗ یہ صرف و نحو کے مماثل ہے فرق اتنا ہے کہ صرف و نحو کا تعلق بالراست نثر سے ہے لیکن عروض کا تعلق صرف نظم سے ہے صرف و نحو کے قواعد سے عبارت آرائی یعنی نثر لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ اور نثر [کا] امتحان عبارت آرائی مضمون نویسی اور تحلیل صرفی و نحوی [کے] ذریعہ لیا جاتا ہے۔ لیکن نظم کا امتحان شعر لکھنے اور نظم نگار[ی] کے ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ صرف تقطیع کرائی جاتی ہے۔ یعنی نظ[م] کی عملی تعلیم اور اس کے امتحان جیسے جزو اعظم کو چھوڑ د[یا] گیا ہے۔ صرف جزو قلیل ترین کی تعلیم کو مدنظر رکھا گیا ہے جو تعلیمات زبان و ادب کا صریحی نقص ہے اور محتاج غور و فکر

اگر مسائل صرف و نحو کا تعلیمی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے اور انگریزی ادب کے قواعد زبان کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو انشا یعنی کمپوزیشن بحیثیت موضوع لہٗ اپنی اہمیت کو نمایاں طور پر واضح کرتی ہے۔ یعنی صرف و نحو کا اصل موضوع لہٗ بجائے تحلیل صرفی و نحوی کے "صحیح نثر لکھنا" لیکن علم عروض کا موضوع لہٗ "صحیح نظم لکھنا" نہیں قرا[ر] دیا گیا۔ بلکہ محض لکھی ہوئی نظم کی صحت کی جانچ یعنی تقطیع قرار دیا گیا ہے جو تعلیمات کے اصولی نقطۂ نظر سے بہت بڑی غلطی ہے۔

کمپوزیشن (انشاء) صرف و نحو اور عروض میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے کچھ عرصہ قبل یہ کمپوزیشن اردو میں ساینٹفک

طور پر موجود نہ تھا لیکن اس کی عملی تعلیم ہمیشہ سے ناگزیر رہی ہے۔ موجودہ رجحان نصابِ تعلیم میں کمپوزیشن کے ادخال کو تسلیم کرتا جارہا ہے۔ چنانچہ صوبہ پنجاب میں چند مولفین نے اردو کمپوزیشن پر معیاری اور سائنٹفک کتابیں تالیف کی ہیں جو داخلِ نصاب ہوچکی ہیں۔ دیگر صوبہ جات میں اور ہماری ریاست ابدمدت میں کمپوزیشن کی تعلیم غیر اصولی طور پر دی تو جاتی ہے لیکن معیاری کتب تاحال تالیف نہیں کی گئی ہیں۔ مثلاً ہم لفظوں کا صحیح استعمال اور ان کی مناسب ترتیب و نشست عملاً سکھاتے ہیں جملوں کے ربط و اتصال یعنی عطفی تعلق کی تعلیم دیتے ہیں۔ اغلاط درست کرتے وقت صرفی و نحوی کی توجیہہ کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا سا ہے کہ اردو زبان میں کمپوزیشن کے لئے ابھی تک معیاری اور اصولی کتابیں موجود نہیں ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کمپوزیشن بالکلیہ صرف و نحو کے قواعد پر مبنی ہے یعنی ہم بغیر قواعدِ زبان کے کمپوزیشن کی نہ تعلیم دے سکتے ہیں اور نہ اس پر کتابیں تالیف کرسکتے ہیں۔ دراصل کمپوزیشن تعلیمی نقطۂ نظر سے صرف و نحو کا جزو لاینفک بلکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے حقیقی موضوع لہٰ ہے۔ اگر اس موضوع پر سائنٹفک کتب تالیف کی جائیں تو یقیناً نصاب اور طریقِ تعلیم کا ایک بڑا نقص رفع ہوجائے گا چنانچہ مغربی ماہرینِ تعلیم اس کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے یہاں اس موضوع پر سینکڑوں مستند اور معیاری کتابیں موجود ہیں اور وہ داخلِ نصاب ہیں۔

اگر نثر میں کمپوزیشن کی اہمیت کو تسلیم کرلیا جائے تو نظم میں کمپوزیشن یعنی شاعری کی عملی تعلیم (نظم گوئی) کی ضرورت کا جواز خودبخود ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ کیونکہ جو تعلق صرف و نحو سے کمپوزیشن کو ہے وہی تعلق عروض سے شاعری کی عملی تعلیم کو ہے۔

صرف و نحو میں نثر کے لئے قواعد اور اصول معین کئے گئے ہیں۔ اور عروض میں نظم کے لئے قواعد اور اصول مرتب کئے گئے ہیں۔ یعنی صرف و نحو میں ہم لفظوں اور جملوں کے صحیح استعمال کے لئے قواعد منضبط کرتے ہیں اور عروض میں ارکان بحور کے متعلق قواعد معین کرتے ہیں۔ لیکن صرف و نحو میں لفظوں اور جملوں کے صحیح استعمال کی عملی تعلیم دیتے ہیں جس کو کمپوزیشن (انشا) کہتے ہیں۔ لیکن عروض میں ہم نظم کی کمپوزیشن کی عملی تعلیم نہیں دیتے ہیں۔ جیسے کمپوزیشن نثر کے لئے صرف و نحو جزو لاینفک ہے۔ ایسے ہی نظم کے لئے کمپوزیشن (شعر گوئی) عروض کا جزو لاینفک ہے۔ جس کی طرح اہمیت سے خالی نہیں۔

مزید تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ جیسے ہم نثر میں عبارت صحیح لکھنے کی تعلیم دیتے ہیں ایسے ہی نظم کے لئے ارکان معینہ اور بحور مختصہ کے لئے عملی تعلیم ضروری ہے۔ سادہ لفظوں میں ہم یوں کہیں گے کہ جیسے ہم نثر میں طلبا سے یہ مشق کراتے ہیں کہ مندرجہ ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کرو؟ اور مندرجہ ذیل عنوان پر جملے یا مضمون لکھو؟ یا جملوں میں خالی جگہ چھوڑی ہوئی پر مناسب الفاظ تحریر کرو؟ وغیرہ وغیرہ بالکل اسی طرح ہم کو طلبا سے یہ مشق کرانا چاہئے کہ۔

مندرجہ ذیل ارکان پر الفاظ لکھو؟ مندرجہ ذیل بحور میں اشعار لکھو؟ مندرجہ ذیل قافیہ پر چند قوافی لکھو؟ مندرجہ ذیل اشعار میں خالی جگہ پر موزوں الفاظ درج کرو؟ وغیرہ علم عروض میں ارکان مختص ہیں جو معین ہیں۔ ارکان پر الفاظ کے منطبق کرنے کی تعلیم کچھ مشکل نہیں ہے۔ اگر مشکل کہا بھی جائے تو ناممکن ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ مشق و مزاولت کے بعد بالکل آسان ہوجاتی ہے۔ اب چونکہ بحور ارکان پر مشتمل ہیں تو بحر پر منطبق کرنے کے لئے جملوں کا استعمال بھی مشکل نہیں ہے۔ اس طرح مختص بحر میں شعر لکھنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس طرح منطبق شدہ جملوں سے بنے ہوئے شعر میں تخیل کا معیار کیا ہوگا۔؟

ظاہر ہے کہ جیسے نثر میں استعمال کردہ لفظوں اور جملوں میں

تخیّل بلحاظ استعداد طلبا رہوتا ہے ویسے ہی بحر پر منطبق جملوں کا تخیّل اعلیٰ یا ادنیٰ بلحاظ قابلیت طلبا ہوگا۔

اب نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مولفین نے نثر کے کمپوزیشن پر قلم اُٹھایا اور اس میں کامیاب ہوئے تو شاعری کے کمپوزیشن (نظم گوئی) پر ان کی توجہ کیوں مبذول نہیں ہوئی؟ یا ان کے ذہن رسا نے اس موضوع پر کیوں کام نہیں کیا؟ انھوں نے اب تک کیوں مستند اور معیاری کتابیں تالیف نہیں کیں؟

تعلیمی نفسیات بتلاتی ہے کہ فنون لطیفہ پر محض وہی شخص کام کرسکتا ہے جس کو قدرت نے اس کے لئے طبعی رجحان عطا فرمایا ہو۔ ایسے ہی شاعری کی عملی تعلیم کامیابی کے ساتھ اسی شخص کو دی جاسکتی ہے جس کو فطرت نے طبع موزوں بخشی ہو۔ موسیقی اور نقاشی کا بھی یہی حال ہے کہ تاوقتیکہ ان کے اکتساب کے لئے ودیعت کردہ فطری مادہ نہ ہو انسان ان کو حاصل نہیں کرسکتا۔ تقریباً یہی حال معلمی کا بھی ہے کہ جو شخص طبعاً مدرس نہ ہو وہ اس پیشہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ لیکن شاعری کی عملی تعلیم کے علاوہ تمام فنون لطیفہ پر مستند اور سائنٹفک کتابیں موجود ہیں اور ان کی عملی تعلیم جاری ہے۔

مزید براں قواعد صرف ونحو کے لئے بھی فطری رجحان کا ہونا ضروری ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بڑے سے بڑا ادیب بھی بسا اوقات صرف ونحو پر کامل عبور نہیں رکھتا۔ لیکن پھر بھی اس کی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی حالت علم عروض کی ہے تاوقتیکہ طالب علم طبع موزوں کا مالک نہ ہو عروض پر عبور حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن پھر بھی اس کی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور میرا یہ ادعا ہے کہ جو شخص عروض سیکھ سکتا ہے اس کی شاعری کی عملی تعلیم بہت آسانی کے ساتھ دی جاسکتی ہے۔

ان تمام مباحث سے یہ نتیجہ صاف طور پر اخذ ہوتا ہے کہ جب [illegible] صرف ونحو [illegible] [illegible]

یعنی نظم گوئی کی عملی تعلیم بھی عروض کا جزو لاینفک اور موضوع لہٗ ہونی چاہیئے۔ جیسے نثر کے لئے کمپوزیشن بے حد ضروری اور مفید ثابت ہوتا ہے ویسے ہی نظم کے لئے اس کا کمپوزیشن یعنی نظم نگاری و شعر گوئی بیحد ضروری ہے جو یقیناً مفید ثابت ہوگی۔

مجھے یقین واثق ہے کہ ماہرین تعلیم میری اس مذکورہ بالا رائے سے ضرور اتفاق کریں گے۔ لیکن یہ افسوس کا مقام ہے کہ مولفین نے آج تک شاعری کی عملی تعلیم پر معیاری اور سائنٹفک کتابیں نہیں لکھیں اور نہ ہی سرکاری ادارہ جات نے اس ضروری شعبہ تالیف کی جانب توجہ مبذول فرمائی حالانکہ ہر دور زمانہ میں اور اب بھی ایسے قابل اور موزوں مولفین و مصنفین موجود ہیں جو شاعری کی تعلیم پر معیاری کتب لکھ سکتے تھے۔ لیکن شاید حوصلہ افزائی کے فقدان کی وجہ سے اور ماہرین تعلیم کے سرکاری طور پر اس صنف ادب کی تعلیم کو تسلیم نہ کرنے کی بنا پر وہ اس دلچسپ موضوع پر قلم نہیں اٹھا سکتے۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کی عملی تعلیم غیر ذمہ دارانہ طور پر غیر سرکاری رنگ میں غیر اصولی طرز پر (یعنی اصول تعلیمات سے ہٹ کر) ہمیشہ جاری رہی اور جاری ہے۔ ... یہ درسگاہیں محفلہائے مشاعرہ ہیں۔ جہاں طالبان شعر گوئی سے یہ مشق کرائی جاتی ہے کہ ... مصرعہ ... پر اشعار لکھو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اصولی طور پر طلبا سے یہ پوچھا جانا چاہیئے تھا کہ "مندرجہ ذیل بحور میں اشعار موزوں کرو" لیکن نفس مطلب ایک ہی ہے یعنی شاعری کی عملی تعلیم! ——— اب یہ طلبا کوئی سرکاری یا عام درسگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اساتذہ کی خوشامد کرتے پھرتے ہیں۔ ... اٹھاتے ہیں (فیس وغیرہ ... [illegible]

طور پر ... تعلیم ... [illegible]

کہ ... [illegible]

یا ترمیم کردی جاتی ہے اور بیچارے طالب علم کو یہ کچھ
ب بتلایا جاتا تاکہ یہ ترمیم و تنسیخ کیوں کی گئی ہے - اول تو
اوقات اساتذہ ہی اصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں
م یہ کہ اساتذہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ جو اصول طالب علم
بیان کریں گے ان کو وہ کماحقہ نہیں سمجھ سکے گا علاوہ ازیں
تاد سے یہ توقع رکھنا کہ ہر شعر یا مصرعہ کی ترمیم کے وقت
تمام ابتدائی اور انتہائی اصولوں کو ہر طالب علم کو فرداً فرداً
بتاتے رہیں غیر معقول ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

مختصراً یہ کہ یہ درسگاہیں (مشاعرہ اور مکانات اساتذہ) نہ تو باقاعدہ مدارس ہیں نہ ان کے اساتذہ ذمہ دار حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ خود اصول تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تعداد ان کی غیر مستند ہوتی ہے۔ اور نہ ہی طلبا حصول تعلیم میں باقاعدگی برتتے ہیں۔ سب سے زیادہ یہ ہے کہ اساتذہ اور طلبا دونوں کے پاس کوئی نصاب تعلیم ہی نہیں ہوتا۔ اور طریقہ تعلیم ظاہر ہے کہ ناقص ترین ہوتا ہے۔

لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ اس بے اصولی اور غیر ذمہ دارانہ طرز تعلیم کے موجود ہوتے ہوئے کیا حکومت اور سررشتہ تعلیمات چشم پوشی کر کے اپنی سرکاری ذمہ داری اور فرض سے برأت کا جواز حاصل کر سکتے ہیں؟ کون نہیں جانتا کہ بے اصولی اور غیر ذمہ دارانہ تعلیم میں طلبا کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور کتنے ہونہار طلبا معیاری کتب اور صحیح تدریس نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے دست کش ہو جاتے ہیں۔ اور کتنے طبع موزوں کے مالک طلبا شاعری کی عملی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے۔ نظم کا کمپوزیشن داخل نصاب نہ ہونے کی وجہ سے اپنی اُجاگر ہونے والی صلاحیتیں کھو بیٹھتے ہیں۔

فنون لطیفہ کے لئے مخصوص اور علیحدہ درسگاہیں قائم کی جا چکی ہیں۔ ان [illegible] کے لئے مناسب مقرر [illegible] بہتر معیاری کتب تالیف ہو رہی ہیں جن کے ذریعہ سائنٹفک تعلیم دی جا رہی ہے۔ اگر حکومت اور سررشتہ تعلیمات کے ماہرین یہ مناسب خیال کریں کہ شاعری کے لئے بھی علیحدہ کالج قایم کئے جائیں۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بلکہ میں خود اس رائے سے اتفاق کروں گا تاکہ محض طبع موزوں کے مالک طلبا فطری رجحان رکھنے والے تشنگان شعر و سخن اس حسین ترین سرچشمہ ادب سے سیراب و مستفید ہوں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب نثر کے لئے قواعد صرف و نحو اور نثر کی کمپوزیشن عام مدارس میں داخل نصاب ہیں اور نظم کے لئے عروض کو آرٹس کالج اور مدارس میں داخل نصاب کیا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ نظم کے کمپوزیشن (شاعری کی عملی تعلیم) کو بھی کیوں نہ داخل نصاب کیا جائے [illegible] اور مفید موضوع پر مستند اور موزوں مولفین سے معیاری اور سائنٹفک کتابیں تالیف کرائی جائیں [illegible] اور [illegible] نیز اس [illegible] کی تعلیم کے لئے موزوں اور مناسب اساتذہ فراہم کئے جائیں۔

میرا ذاتی تعلیمی تجربہ بتلاتا ہے کہ ایک اچھا ادیب بھی بسا اوقات صرف و نحو کی تعلیم نہیں دے سکتا اور کبھی کبھی ایک اچھا شاعر بھی عروض کی تعلیم نہیں دے سکتا۔ چنانچہ یہی دشواری شاعری کی عملی تعلیم دینے کے لئے بھی لاحق ہوگی لیکن اس کا حل کچھ مشکل بھی نہیں ہے۔

جہاں نثر کے ساتھ نظم کے صرف [illegible] پڑھانے کے لئے اچھے ادیب مقرر کئے جاتے ہیں وہاں ایک ایسا معلم بھی مقرر کیا جا سکتا ہے جو طبع موزوں کا مالک ہو اور نظم و نثر پر عبور رکھنے کے علاوہ صرف و نحو، کمپوزیشن، عروض اور شاعری کی عملی تعلیم یعنی نظم گوئی کے لئے خاص اور مستند اہلیت رکھتا ہو اور [illegible] اضافہ [illegible] خاص طور پر کامیابی کے ساتھ تعلیم دے سکتا ہو۔

[illegible] اتفاق کریں گے

کہ جو طبائع صرف و نحو سے فطری لگاؤ رکھتے ہیں وہ عروض کے لئے بھی رجحان طبعی کے مالک ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ماہرین تعلیم نے ضروری خیال کیا ہے کہ مسائل صرف و نحو اور عروض کو یکجا تالیف کیا جائے۔ یعنی ایک ہی کتاب میں ان دونوں کو لکھا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

اس نظم گوئی یعنی شاعری کی عملی تعلیم کا افادہ وہی ہوگا جو صرف و نحو کی تعلیم سے ہوتا ہے یعنی جن طلباء کی طبائع غیر موزوں ہوں گی وہ محض معمولی شدھ بدھ حاصل کرلیں گے جو کسی طرح فائدے سے خالی نہیں ہے اور جن کی طبائع موزوں ہوں گی وہ اس سائنٹفک اور باقاعدہ تعلیم سے تھوڑی سی مدت میں ملک کے مایۂ ناز شاعر و ناظم بن سکیں گے اور سب سے زیادہ فائدہ یہ ہوگا کہ بہت سے طبع موزوں رکھنے والے طلبا کی فطری صلاحیتیں ضائع نہ ہوں گی جیسا کہ موجودہ دور میں نظم گوئی کی باقاعدہ اور سائنٹفک تعلیم کی سہولتیں بہم نہ ہونے سے ناکارہ اور ضائع ہو جاتی ہیں بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ طلبا میں بہت سی ایسی صلاحیتیں ودیعت کردۂ فطرت ہوتی ہیں لیکن ماحول میں تحریک کے سامان نہ ہونے کی وجہ سے سوتی رہتی ہیں حتیٰ کہ کبھی بالکل مردہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن تحریک کے اسباب موجود ہونے پر اجاگر ہوتی ہیں اور ان میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شاعری کی عملی تعلیم داخل نصاب نہ ہونے سے بہت سے موزوں طبع شعر تیس چالیس سال کی عمر میں شاعری شروع کرتے ہیں اور مشق سخن کم ہونے سے ادب کی خدمت کما حقہٗ کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

ان تمام امور سے قطع نظر یہ فائدہ تو ضرور حاصل ہوگا کہ تقریباً تمام طلبا نظم گوئی کے قواعد اس کے حسن و قبح سے کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہو جائیں گے۔ اور ان میں صحیح نقد و نظر کا مادہ پیدا ہو جائے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر دور میں (اور دور حاضر میں خاص طور پر) ایسے نقاد پیدا ہوئے ہیں کہ جو شعر صحیح تک نہیں پڑھ سکتے لیکن وہ نظم پر بڑی شان سے تنقید لکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ عروضی نقطۂ نظر سے شعر کے حسن و قبح سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔

اس کا دوسرا رخ بھی افادہ سے خالی نہیں ہے یعنی نظم گوئی کی تعلیم ہونے سے ابتدا ہی سے غیر موزوں طبائع کو اپنی ناموزونیت کا قوی احساس پیدا ہو جائے گا اور وہ (دور حاضر کے لاتعداد متشاعروں کی طرح) شاعری پر اپنا وقت بیکار صرف نہ کریں گے۔

بہر حال بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے نثر میں کمپوزیشن سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہی افادہ نظم کے کمپوزیشن (نظم گوئی کی عملی تعلیم) سے حاصل ہوگا۔ لہذا میں ماہرین تعلیم کو اس سلسلے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے تائید کا طالب ہوں اور سررشتہ تعلیم سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ نصاب تعلیمات میں شاعری کی عملی تعلیم کو تسلیم کرتے ہوئے داخل نصاب کرنا منظور فرمائے اور موزوں اور مستند ماہرین سے اس موضوع پر جلد از جلد کتابیں تالیف کرائے۔ تاکہ زبان و ادب کی تعلیم کی اہم تشنگی رفع ہو جائے۔

نشاط القادری

پاگل

(گیت)

کون تجھے سمجھائے رے پاگل کون تجھے سمجھائے
غیر کو اپنا کیوں سمجھا ہے کاہے رنج اُٹھائے
جھوٹی آشاؤں میں پڑ کر دکھ کاہے کو اُٹھائے
کوئی نہیں ہے جگ میں تیرا مفت میں دھوکا کھائے
کون تجھے سمجھائے رے پاگل کون تجھے سمجھائے

دھن والوں کی مِتر ہے دنیا کنگالوں سے بیر
من والوں کو کوئی نہ پوچھے یہ بدھی کا پھیر
مایا کے بندھن میں پھنس کر کاہے جان گنوائے
کون تجھے سمجھائے رے پاگل کون تجھے سمجھائے

یہ دنیا ہے دکھ کی رانی دکھ میں سب کو بانٹے
پھول سمجھتا ہے جسکو تو اصل میں ہیں کانٹے
اِس گلشن میں دو دن کھل کر کلی کلی مرجھائے
کون تجھے سمجھائے رے پاگل کون تجھے سمجھائے

کایا جھوٹی مایا جھوٹی جھوٹا سب سنسار
من کی چنچل آشا جھوٹی جھوٹا تیرا پیار
آگ سے کر کے پریم پتنگا جنم جنم مرجھائے
کون تجھے سمجھائے رے پاگل کون تجھے سمجھائے

ریڈیائی ڈرامہ

عشرت انصاری

سچ

افراد

زبیدہ - حمید کی جوان بیوی
فہیمن - زبیدہ کی پڑوسن
حمید - زبیدہ کے شوہر

زبیدہ - اسی وقت میں سمجھ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

فہیمن - ہوں، یوں تو ضرورت ہی کیا تھی - ختنہ سکینہ کے لڑکے کا تھا نہ کہ انکے اپنے کا۔

زبیدہ - ارے غضب خدا کا تھوڑا بھی نہیں - پچاس روپئے کی ریزگاری سوت کو خوش کرنے کے لئے دکھا دکھا کر پھونک دینا کہاں کی دانشمندی ہے - کل موہی کوئی ایسی خوبصورت بھی تو نہیں نوج - !

فہیمن - خدا کو یاد کرو بہن - کیسی خوبصورتی - جوانی تو ڈھلتی دھوپ کی طرح زرد پڑ گئی ہے - ہاں رنگ ذرا صاف ہے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

زبیدہ - لو پان کھاؤ - بو بو میں تو تنگ آگئی ہوں - سارے گاؤں میں تھڑی تھڑی ہو رہی ہے ان سے ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ اگر وہ ایسی ہی پسند ہے تو کرلو نکاح - میرا مولا حافظ ہے - جس نے دیا تن کو وہی دیگا کفن کو۔

فہیمن - ارے اب تک تو نکاح ہو بھی گیا ہوتا - پرسوں رسول پور گئی تھی - سکینہ کے یہاں بھی ٹوہ لگانے چلی گئی - باتوں میں بات چل نکلی - معلوم ہوا کہ گھر بھر راضی ہے - صرف اس کا بڑا بھائی آڑے آ رہا ہے - وہ کہتا ہے کہ بہن کے گلے میں رسّی باندھ کر ندی میں ڈبو دیں گے - مگر اس بڈھے کے ساتھ نکاح ہونے نہیں دیں گے۔

زبیدہ - خدا کرے اس کی باتیں سچ ثابت ہوں - لیکن بہن میرے دل میں پھر بھی چور گھسا ہوا ہے دومت دیکھ کر سب کی رال ٹپک پڑتی ہے۔

فہیمن - مگر محمود سے ایسی امید نہیں - وہ شہر ہو آیا ہے - وہاں کی ہوا بھی لگ گئی ہے - اس لئے وہ اپنے بھر تو ایسا ہونے نہیں دے گا - لیکن پھر قسمت کی باتوں کو کون ٹال سکتا ہے۔

زبیدہ - مگر پھر بھی - آہ ! کیا بتاؤں کہ میں کس مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں - دن رات طعنے تشنے سنتے سنتے کان پک گئے - ذرا ذرا سی بات پر بری طرح بگڑ جاتے ہیں اور اتنی بری بری گالیاں سننی پڑتی ہیں کہ توبہ ہی بھلی (رنڈھی ہو کر) ایسی زندگی سے تو موت کو ترجیح دیتی ہوں - کوستی ہوں ابّا میاں کو کہ انہوں نے جان بوجھ کر ایک ایسے شخص کے پلّے مجھے باندھا جو قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے ہے - میں اسی پہ صبر شکر کرکے

بیٹھی تھی۔ اگر ایسی ہی قسمت والی ہوتی تو بیاہتا شوہر کو کیوں موند لیتی (سسکی) ہزاروں جگہوں سے میرے لئے پیغامات آئے تھے۔ مگر ابا کو تو یہی ایک پسند تھے۔ انکے پاس سونے کی چڑیا جو تھی۔

فہمین ۔ مت رو بہن۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ وہ مرضئ مولا۔

زبیدہ ۔ (بدستور سسکیوں کے ساتھ) میں رو نہیں رہی ہوں۔ مگر بیتی باتیں یاد آجانے سے کلیجے پر چھری سی پھر جاتی ہے۔ اماں خلاف تھیں۔ لیکن ابا کے آگے انکی ایک نہیں چل پاتی تھی۔ ابا کے وہ آخری جملے ابتک میری یادداشت میں انگارے کیطرح دہک رہے ہیں "کہ میں سکھی رہونگی۔" مگر آہ! آج میں دُکھی ہوں دُنیا میں سب سے زیادہ دُکھی!

فہمین ۔ رونے دھونے سے کچھ فائدہ نہیں۔ صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔

زبیدہ ۔ صبر۔ صبر کرتے کرتے تو کلیجے میں ہزاروں زخم پڑ گئے ہیں۔ میں ہزار ان سے کہتی ہوں کہ مجھے طلاق دیدیں اور اُسی کو اپنے گھر کی رانی بنالیں۔ لیکن وہ تو جیسے میرے سینے پر مونگ دلنے کی قسم کھا چکے ہیں۔

فہمین ۔ صبر کرو گھبراؤ نہیں۔ سب کام اچھا ہی ہوگا۔ اچھا تو اب میں چلی۔ پھر فرصت کے وقت آؤں گی۔

وقفہ

زبیدہ ۔ اے نوج! میری جوتی کو کیا غرض کہ میں شکایت کرتی پھروں۔

حمید ۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ سب تمھاری ہی کارستانی ہے۔ آج چاروں طرف سے تمھارے ہی شر سے مجھ پر اشارے ہو رہے ہیں۔

زبیدہ ۔ میرے شر سے کیوں۔ جو جیسا کرے گا ویسا ہی بھریگا۔

حمید ۔ یہ تمھارا نہیں بلکہ تمہاری ذات کا قصور ہے۔

زبیدہ ۔ خواہ مخواہ کی چھیڑ خانی اچھی نہیں لگتی ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہہ لو۔ مگر میری ذات کو کیوں سو مدتے ہو۔ پھر کہے جارہی ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتی۔

حمید ۔ تم کچھ نہیں جانتی ہو۔ کیوں؟ صرف سکینہ کے بارے میں مجھے بدنام کرنا جانتی ہو۔

زبیدہ ۔ توبہ توبہ! قسم لیلو۔ جو میں نے کبھی بھی کسی سے ایک لفظ کہا ہو۔ پھر میں کہتی ہوں کہ اسمیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ خدا کا دیا گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ لاکر بٹھالو اسے بھی۔

حمید ۔ یہ بات ہے۔ اب آئی ہو مطلب پر۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتی ہو کہ حسد و جلن سے مری جارہی ہو۔

زبیدہ ۔ صاف صاف کیا کہوں۔ نسیمن کو زیادہ ملنے سے میٹھا ہو جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ میٹھا ہونے سے پہلے ہی اسکے ٹکڑے کر ڈالو۔

حمید ۔ دیکھ رہا ہوں۔ کہ تمہارے سر سے بھوت اتارنا ہی پڑیگا۔

زبیدہ ۔ اے نوج بھوت کسی تمہاری ہوتی کے سر ہوگا۔ میرے کیوں۔ ہاں اتنا کہے بغیر جو کہوں گی نہیں کہ اس بڈھے سر پر عشق کا جنون سوار ہے۔

حمید ۔ اف! یہ سور کی بچی چپ نہیں رہے گی۔

زبیدہ ۔ تمہاری سکینہ ہی ہوگی سور کی بچی۔

حمید ۔ سکینہ سکینہ عجیب بکواس ہے۔ ہوں! اگر کسی کی کچھ مدد کردو تو یہ کم ظرف عورتیں اسے کیا سے کیا سمجھنے لگتی ہیں۔

زبیدہ ۔ میں خوب سمجھتی ہوں۔ اگر مدد ہی کرنی تھی تو پہلے پڑوس کی اندھی بڑھیا خرافت کی نانی کی مدد کرتے۔ جو ہمیشہ اُپاس کرتی رہتی ہے! کیسی فیاضی ہے کہ محلہ کی مسجد کو اندھیرا چھوڑ کر دوسری جگہ روشنی کی جائے۔

حمید ۔ لاحول ولا قوۃ تم چپ نہیں رہو گی۔ !

زبیدہ۔ میں کہ کب کچھ رہی ہوں۔ مگر اتنا ضرور کہونگی کہ اس سفید ڈاڑھی کا تو کچھ خیال کرد۔ ڈاڑھی مہندی سے رنگ لینے سے لوگ جوان نہیں سمجھنے لگیں گے ہر طرف تھڑی تھڑی ہو رہی ہے۔ تمہارا کیا میرا تو گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو رہا ہے۔ جدھر سنو تمہارے اور سکینہ کے بوڑھے عشق کا ہی چرچا۔ توبہ۔ نوج۔

حمید۔ خدا کی قسم اب اگر تم نے سکینہ کا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔

زبیدہ۔ برا کام ہمیشہ ہوتا ہی ہے برا۔ لیکن اتنا کہے دیتی ہوں کہ میرے جیتے جی اس ڈائن کو میرے گھر میں نہیں لا سکتے ہو۔ اور اگر لانا ہے تو مجھے میرے میکے بھیجکر لانا۔ ورنہ میں اسے زہر دے کر مار ڈالونگی۔

حمید۔ اچھا جب آئے گی تو دیکھا جائے گا۔

زبیدہ۔ دیکھا جائیگا نہیں۔ قسم لیلو تینوں پاروں کی۔ کیا اس ڈائن کو میرے سینے پر مونگ دلنے کیلئے لاؤ گے؟

حمید۔ مگر بلا دجہ ابھی کیا کم میرے سینے پر تم مونگ دل رہی ہو۔ ہر طرف لنکا کی آگ کی طرح تو تمنے افواہ پھیلادی ہے۔ سکینہ بیچاری بھی مارے شرم کے گڑھی جا رہی ہے۔

زبیدہ۔ اے ہے! ایک تم اور ایک وہ بیچاری سکینہ۔ دو ہی تو دنیا میں شرم دار رہ گئے ہیں۔ میں تو جیسے نکٹی ہوں۔ کوستی ہوں ابا کو کہ انہوں نے جان بوجھ کر مجھے گڑھے میں ڈھکیل دیا۔ ورنہ میرے لئے ہزاروں جگہ سے پیغامات آتے تھے۔

حمید۔ کیوں جھوٹ بول رہی ہو۔ کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ تمہارے ابا تو میرے پیچھے جیسے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا میں نے تمہیں اپنے گلے مڑھ لیا۔ ورنہ ....

زبیدہ۔ ورنہ کیا؟ کیا میں پتی پر دھری تھی قسم ہے تمہیں اپنے سب سے پیارے کی مجھے میرے میکے بھیجے بغیر اگر تم پانی پیو تو حرام ہے۔ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہروں گی۔ میں آج سے بیوہ ہوگئی ہوں۔ یہ لو (چوڑیاں ٹوٹنے کی آواز)

حمید۔ ہائیں ہائیں۔ ارے۔ ارے! ہاتھوں کی نئی چوڑیاں کیوں توڑے ڈال رہی ہو!

زبیدہ۔ خبردار مجھے اب ہاتھ چھونا۔ تمہیں قسم ہے کہ مجھے نہ چھوڑ دو۔ لاؤ اسی سوت کو رکھو۔ مگر اتنا بتائے جاتی ہوں کہ جس لالچ سے تم اس سے نکاح کرنا چاہتے ہو وہ امید کبھی بھی پوری نہ ہوگی۔ میں کوئی بانجھ نہیں ہوں۔ تمہیں میں وہ خرابی ہے۔

حمید۔ سور۔ کمینی۔ چپ۔ رہتی ہے کہ نہیں!

زبیدہ۔ میں چپ نہیں رہوں گی۔ میں بیوہ ہوگئی ہوں، میں نے سب چوڑیاں ٹھنڈی کر دی ہیں۔

حمید۔ اچھا ٹھیر۔ میں ہی تیرا دماغ ٹھنڈا کئے دے رہا ہوں۔ یہ لے! سور۔ کمینی! ....

مارنے کی آواز کے ساتھ ساتھ۔ ہائے۔ توبہ۔ نہیں۔ نہیں۔ توبہ۔ اور لے سکینہ کا نام۔ پھر نام لے۔ توبہ نہیں۔ ہائے اللہ! ایک چیخ کے ساتھ فیڈ آوٹ کر دیا جائے۔

زہرہ کیلئے

اکرم الہ آبادی

مشکلے نیست کہ آسان نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

زمانے کے بیدرد ہاتھوں نے اُسکی تمناؤں کا بے رحمی سے گلا گھونٹ دیا تھا۔ شائد اسکی کوئی بھی آرزو ایسی نہ تھی جو محروم تکمیل نہ رہی ہو۔ لیکن اپنے ہر ارادے اور ہر مقصد میں ناکامی کی پے در پے ٹھوکریں کھانے کے باوجود وہ مایوس نہ ہوا۔ اُمید کی مدھم سی روشنی میں وہ تقدیر کی ان اندھیری راتوں کو روندتا گیا .... اسکے دل میں ابھی تک ایک عزم جوان تھا۔ تقدیر کی زبردست طاقت اُسے ہر بڑھنے والے قدم پر پیچھے ڈھکیلنے کو تلی ہوئی تھی اور وہ بھی اس ہندی انسان کی طرح جو زندگی سے موت تک کی ہر مصیبت سہنے پر تل گیا ہے۔ تقدیر کے بھیانک عنصر یت سے ٹکریں لے رہا تھا۔

وہ روتا ہوا ہی پیدا ہوا تھا اور بچپن سے جوانی تک کا زمانہ اُسے طرح طرح کے مصائب اُٹھاتے ہی گزرا تھا۔ حالانکہ وہ ایک معزز اور شریف خاندان کا فرد تھا۔ مگر اسکا باپ ایک بہت سادہ مزاج اور مفلوک الحال شاعر تھا۔ وہ عزت و شہرت کا دلدادہ نہ تھا۔ اسلئے اپنے شعر و سخن کی دنیا کو اُس نے اپنے تک ہی محدود رکھا اور اس گمنامی کی حالت میں مرگیا۔ اسکی موت پر گھر میں اتنا ہی اثاثہ نہ تھا چند دن ہی اسکی بیوہ بیوی اور دونوں معصوم بچے اطمینان سے گزار سکیں۔

ہندوستان میں وہ لوگ کی [illegible]

غربت کا شکار گنتے ہیں لیکن حقائق کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو سب سے زیادہ غربت اور مصیبت زدہ طبقہ ان سفید پوش لوگوں کا ہے۔ جن کے جسم دیکھنے میں اُجلے لباس سے ملبوس رہتے ہیں۔ مگر جن کے گھروں میں اکثر فاقہ مستیاں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی نام نہاد عزت کو قائم رکھنے کیلئے سفید پوش ضرور نظر آتے ہیں لیکن ان کا خانگی ماحول اس مزدور کے گھر سے بھی زیادہ گرا ہوا ہوتا ہے جسکے آج کے رزق میں کل کا ہی سہارا ہو —— لیکن یہ لوگ اپنی عزت و شرم کی وجہ سے اپنے آنسو دوسروں کی نظروں سے چھپا کر روح سوز مصنوعی مسکراہٹ سے کھیلتے رہتے ہیں۔

وہ بھی اسی طبقہ کا ایک فرد تھا۔ اسکی شکل و صورت لباس و اطوار سے لوگ اسکے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنے میں ہمیشہ غلطی کرتے۔ وہ سمجھتے تھے یہ ہوگا کوئی کھاتا پیتا آدمی لیکن یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ اکثر اسکے گھر کی راتیں تاریکی میں گزرتی ہیں اور دن خموشی میں کسے خبر تھی کہ مادر ہند کی سینکڑوں ایسی دختریں جو شریف گھرانوں کی چاردیواری میں گھٹی زندگی بسر کر رہی ہیں اُن کے بدن پر مشکل پوشاکیں ہیں نہ ہونٹوں پر مسکراہٹیں۔ کسی کے سر پر دوپٹہ نہیں۔ [illegible]

[illegible]

انور کی آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور دل ماں بہن کی حالت زار دیکھ کر رو اٹھتا۔ مگر پھر بھی وہ ہر مصیبت کو انتہائی ضبط کے ساتھ جھیل رہا تھا۔

کئی جگہ اُسے ملازمتیں مل ہی گئیں مگر بہت معمولی اور وہ بھی ہزار کوششوں پر لیکن تقدیر کے آگے کسکا زور ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ بہانے سے اُسے جواب مل گیا۔ سرمایہ داروں نے تو اُسے خوب دھوکا دیا تھا کسی نے کام کرا کے تنخواہ نہ دی۔ کسی نے جھوٹا الزام لگا کر تنخواہ ضبط کر لی کسی نے چوری کا جھوٹا الزام لگا دیا اور کسی نے صرف باتوں باتوں میں پھسلا کر کام نکال لیا ــــ وہ ایک اچھا آرٹسٹ بھی تھا۔ اچھا ادیب و شاعر بھی۔ اُسکا دماغ کچھ قدرتی طور پر ہر تنظیم پر حاوی ہو جانے کی حیثیت رکھتا تھا مگر سب سے بڑی بدنصیبی یہ کہ وہ غریب تھا۔ اسلئے اُسکے اس دنیا میں کوئی قدر نہ تھی وہ کیچڑ میں پڑا ہوا ایک ہیرا تھا جسے پتھر سمجھ کر لوگ ٹھکرا دیتے تھے۔ ــــــ

تقدیر کی ان تمام ستم ظریفیوں کے باوجود ہمت نہ ہارا اور اس وسیع خلیج میں ہاتھ پاؤں مارا کیا نہ ساحل نظروں میں تھا نہ منزل کا نشان ـ پھر بھی وہ موج حوادث سے ٹکرا ٹکرا کر ایک اُمید کی روشنی میں انجانی سمت بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے آرٹ سے محبت تھی ۔ ادب سے عشق تھا۔ موسیقی سے انسیت تھی۔ مگر وہ اپنی ان دلچسپیوں کی تکمیل ہی کیونکر کر سکتا تھا اسکی بدنصیبی نے اُسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ اپنے فطری تقاضوں کو پورا کر سکے۔

تمنائیں تو بہت تھیں مگر قدرت بھی وہی تھوڑا چاہتی ہے جو انسان چاہے ــــــ

بہن جوان ہو چکی تھی ـ اسکی شادی کی فکر اُسے الگ ستائے جا رہی تھی ـ طرفہ لطف یہ کہ پڑوس والے بنگلہ میں جو خانصاحب رہتے تھے۔ ایک دن کہیں ان کی نوجوان اور فتنۂ قیامت صاحبزادی ـ زہرہ سے انور کی نگاہیں لڑ گئیں ــــ غریب کے سینے میں بھی دل ہوا کرتا ہے ـ اور پھر وہ تو ایک تعلیم یافتہ جذباتی نوجوان تھا ـ دل دے بیٹھا اور اسکی محبت میں ایسا دیوانہ ہوا کہ اپنی غریبی کو بھی بھول گیا گھر بار کا ہوش نہ رہا ــ ـ اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ اسکی بیوہ ماں اور بدنصیب بہن اُس کے سہارے جی رہی تھیں

زہرہ بظاہر بہت مغرور اور سرد جذبات لڑکی معلوم ہوتی تھی مگر سیرت کی پاکیزہ اور دوربین واقع ہوئی تھی وہ بڑی خاموشی سے انور کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اسی وجہ سے انور پر اُسے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ اُسے انور کا کچھ بھی خیال ہے ـ کبھی انور سے اگر اسکی نظریں مل جاتیں تو وہ نفرت سے نظریں پھیر لیتی اور انور کے آنکھوں میں آنسو چھلکتے رہ جاتے۔

اسی طرح نہ جانے کتنے ماہ گزر گئے اور انور کی حالت دن بدن گرتی گئی ـ زہرہ اُسے محسوس ضرور کر رہی تھی مگر خموش تھی ـ انور کی ماں بہن اُسکی اس بدلتی حالت پر تعجب و تذبذب میں مبتلا تھیں بوڑھی ماں رو رو کر خدا سے دُعائیں مانگ رہی تھی کہ انور صحیح راستے پر آ جائے۔ اور بہن اس فکر میں تھی کہ اُداسی کا سبب دریافت کر سکے گھر کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جا رہی تھی ـ انور بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر مجبور تھا کہ زہرہ کی محبت نے اُسکے احساسات کو ہر طرف سے مردہ سا کر دیا تھا۔

اچانک زہرہ کی منگنی کی خبر سنکر وہ بیمار پڑ گیا۔ خانصاحب کے کسی رشتہ دار کا ایک پڑھا لکھا لڑکا تھا ـ اقبال ـ کسی سرکاری محکمے میں چار پانچ سو روپے ماہوار پر لگا تھا ـ بھلا کہاں وہ اور کہاں غریب انور وہ پہلے ہی زہرہ کے برتاؤ سے مایوس ہو چکا تھا ـ اس اچانک صدمے نے اُسے بستر پر ڈالدیا۔

ماں بہن گھبرا گئیں ـ ماں نے اپنی ممتا کا واسطہ دے کر اُس سے کہا ـ

"بیٹا - خدا کے لئے اپنی حالت سنبھالو - ورنہ ہم لوگ کس کنارے لگیں گے ــــ"

"ماں - اب تم ہی سمجھ لو - کہ انور مر چکا ہے - قسمت نے مجھے بالکل برباد کر دیا ہے میں اب جینا نہیں چاہتا ــ" وہ آنکھوں سے آنسو بھر کر بولا -

"او خدا مجھے بیوہ کا ایک ہی تو سہارا ہے - اُس پر بھی تجھے رحم نہیں آتا -" بوڑھی ماں گڑگڑاتی ہوئی سجدہ میں گر پڑی -

ایک طوفان سا آرہا تھا - نہ معلوم کیسا -

"بھیا تم تو کہتے تھے میں تقدیر سے لڑوں گا - میں ہمت نہیں ہاروں گا - اب کیوں جی چھوڑ رہے ہو ــ" بہن نے اُس سے پوچھا -

راشدہ - میں تقدیر سے ضرور لڑتا رہتا - مگر اب کس کے لئے جسے اپنے محبت کرنے والے سے ہی نفرت ہو اُس کیلئے کیا تقدیر سے لڑوں ــــ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا

"کون ہے وہ ـــــ آج تو بتا دو بھیا" راشدہ نے التجا کی -

"زہرا . . . . . ." یہ کہکر وہ رو دیا -

کچھ دیر بعد راشدہ خموشی سے اُٹھکر چلی گئی -

آج پہلی بار وہ زہرا سے ملنے گئی - آج اُسے اپنے میلے اور پھٹے کپڑوں پر شرم ہی نہیں آرہی تھی - بھائی کی زندگی کا سوال تھا نا ــ زہرہ اُسے حیرت سے دیکھنے لگی جیسے وہ کچھ نہ - اُس پر گرجنا شروع کر دیا -

"حسن مغرور ضرور ہوتا ہے بہن - مگر اسکے یہ معنی نہیں کہ کوئی اُس پر اپنی زندگی برباد کر دے - اُسے ذرّہ برابر خیال نہ ہو . . . . . . تم نے میرے بھیا کی زندگی برباد کی ہے - تمنے ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے ـــ اور اب ــــ اب" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز حلق میں اٹک گئی -

"کہو بہن - کہتے جاؤ -" زہرا سنجیدگی سے بولی -

"اب جبکہ وہ زندگی سے مایوس موت کے بستر پر پڑے ہوئے تمہارا ہی نام رٹ رٹ کر آخری گھڑیاں گن رہے ہیں . . . . تم خوشی کے قہقہے لگا رہی ہو - اسی خوشی میں بہار کے ترانے گا رہی ہو کہ کل تمہاری شادی اور کس کی موت ہو گی -"

"میں سمجھی نہیں بہن - یہ تم کیا کہے ڈال رہی ہو" زہرہ گھبرا کر پوچھ اُٹھی -

"کیا تم بدنصیب انور کو نہیں جانتیں - میں اُسی برباد محبت کی بہن ہوں -"

"انور ؟ کیا ہوا انہیں" وہ یکایک صوفہ پر سے اچھل پڑی -

"خود چلکر دیکھ لو - شائد تمہاری آنی مہربانی ہی انہیں زندگی بخشدے" راشدہ نے زہرہ کے دونوں ہاتھ تھام کر التجا کی "میں اچھا چلتی ہوں -"

یہ کہکر وہ دوسرے کمرے میں برقعہ لینے چلی گئی -

پشت والے دروازہ سے نکلکر سبکی نظروں سے چھپتی ہوئی وہ دونوں انور کے گھر پہنچ گئیں - راشدہ باہر سے ٹھہر گئی اور زہرہ جھجکتے جھجکتے اندر داخل ہوئی -

انور اُسوقت خاموش پڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا - دو آنسو رخسار پر چمک رہے تھے - زہرہ کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ آگے بڑھ سکے - شرم نے اُس کے قدم گاڑ دئے تھے کہ اچانک خود انور کی نگاہیں ادھر پڑ گئیں - جیسے کوئی سوتے سوتے چونک پڑے -

ارے - آپ . . . وہ چیخا ــــ "او خدا . . . . یہ تصویر تو نہیں ہے -" اُس نے اپنی آنکھوں پر یقین نہ کرتے ہوئے کہا - زہرہ کے منہ سے آواز نہ نکل سکی -

انور نے اپنے منہ میں انگلی ڈال کر کاٹ لی - واقعی وہ جاگ رہا تھا - مگر اُسکی اس حرکت پر زہرہ بغیر مسکرائے

نہ رہ سکی۔

"وہ آئیں میرے گھر خدا کی قدرت ہے" وہ نحیف آواز میں بولا۔ اور اسکے بعد اُس نے زہرہ کے استقبال کیلئے اُٹھ کر چلنا چاہا مگر نقاہت کی سبب لڑکھڑا کر گر پڑا۔

زہرہ نے بے قرار ہو کر اُسے تھام لیا "کاش گرتے کو تھام لے ساقی" انور کے منہ سے نکل گیا۔

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے آپ نے اپنا"

"میں نے؟ —— نہیں تو —— یہ تو سب میری نا قدرائے محبت کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے"۔

"میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکیئے۔ خدا را اپنے آپ کو سنبھالئے۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"اوہ —— تو آپ کو مجھ سے ہمدردی بھی ہے ——

یہ کیوں؟ ——" انور نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا ——

زہرہ جواب نہ دے سکی۔

"کیا میری بربادیوں کا مذاق اُڑانے آئی ہیں آپ" وہ اسکی خاموشی کو غلط سمجھکر بولا۔

"ایسا نہ کہئے —— میں اندھی نہیں ——" میں پتھر نہیں" پتھر کا بت آخر بول ہی اُٹھا ——

"تو پھر کیوں نہ کہہ دیا پہلے ہی تم نے کہ تمہیں مجھ سے نفرت نہیں —— اچھی زہرہ۔ جب تم جانتی تھیں کہ تمہیں بدنصیب انور کی زندگی ہو تو پھر پہلے ہی کیوں نہ گرتے کو سنبھال لیا تم نے۔۔ وہ محبت بھرے جذبات کے ساتھ "عورت کہنا چاہے مگر نہیں کہہ سکتی۔ مرد نہ کہنا چاہے تو بھی کہہ سکتا ہے۔

"تو کیا میں سمجھ لوں کہ میں وہ بدنصیب نہیں جسکی محبت کو ٹھکرا دیا گیا ہو۔

زہرہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔ انور نے بیقرار ہو کر پوچھا —— "اب آپ اقرار کر کے ہی چھوڑیں گے بھیا"

"بھلا انہیں اگر آپ سے محبت نہ ہوتی تو میرے ساتھ کیسے آجاتیں" راشدہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔ زہرہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"تم کتنی اچھی ہو زہرہ" یہ کہکر انور نے زہرہ کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ اور شرما گئی۔

انور کا بیمار چہرہ فرط مسرت سے سُرخ ہو رہا تھا مگر فوراً بعد ہی وہ اُداس ہو گیا۔ زہرہ تڑپ گئی۔ "کیا ہو گیا آپ کو۔" اُس نے پوچھا۔

میری یہ مسرت ہی عارضی ہے زہرہ۔ جب چند دنوں کے بعد میں تمہیں دیکھنے سے ہی محروم ہو جاؤں گا۔ تم چلی جاؤ گی —— کاش کہ مجھے وہ وقت دیکھنا نصیب ہی نہ ہو" یہ کہکر اُسے ڈوبتے دل کو تھام لیا۔ زہرہ سمجھ گئی۔ مگر مسکرا دی۔

"تم ہنس رہی ہو۔ حیرت سے انور نے پوچھا۔

"اباجان تمہاری حالت سے واقف ہو چکے ہیں اور اُنہوں نے یہ فیصلہ میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے ——"

وہ بولی ——

"تب" حضور حسن سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے"

"آپ ......اپنی والدہ کو ...—— کہتے کہتے وہ پھر شرما گئی۔

چنانچہ دوسرے دن میں رشتے کی بات زہرہ کے والد کے کانوں تک پہونچ گئی۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ زہرہ کی شادی کو ملتوی کر دوں۔ لیکن زہرہ کو حاصل کرنے کیلئے انور کو اقبال بننا پڑے گا۔ میں صرف ۲ سال تک کا وقفہ دے سکتا ہوں اسے۔

فیصلہ نرم تھا اور صحیح —— لہذا۔ انور کی ماں رضا کا اظہار کر کے واپس لوٹ آئی۔ لیکن اُداس و پریشان —— اُسے اُمید نہ تھی کہ انور جو مدتوں تقدیر سے لڑ چکا ہے مگر اب تک کامیاب نہ ہو سکا۔

اقبال جیسی حیثیت بنانے کے قابل ہو جائے گا۔ ——

انور نے جوقت خانصاحب کا فیصلہ سُنا - ایک تازہ روح سی اُسمیں پیدا ہوگئی ، جیسے پھر سے جی اُٹھا ہو - اپنی آج تک کی تمام مصیبتیں وہ بھول گیا - زہرہ اُسکی نگاہوں اُسکے خیالوں میں رقص کر رہی تھی - اور اُسے ایک خیالی جنت تخیل کے پردوں میں چمکتی سی نظر آنے لگی - جیسے اُس نے زہرہ کو پالیا ہو ———

زہرہ کیلئے وہ سب کچھ کر سکتا تھا - حتیٰ کہ اپنی جان تک دے سکتا تھا -

———

کسی طرح ماں بہن کو سمجھا بجھا کر وہ دوسرے دن ہی ایک دوست سے کچھ قرض لیکر بمبئی روانہ ہوگیا ——— زہرہ کا خیال اُسے راہ دکھا رہا تھا اور محبت کی قوت عزم کو دوبالا کر رہی تھی -

بمبئی پہنچکر دو چار دن تو اُسے فٹ پاتھ پر سونا پڑا مگر اب وہ ہر مصیبت ہنس ہنس کر جھیل رہا تھا - اپنی زہرہ کیلئے

چوتھے دن ایک آفس میں اُسے ملازمت مل گئی - شاید تقدیر نے اپنی ہوا پلٹ دی تھی - یہاں سے ۸۰ روپئے ماہوار ملنے لگی - جسمیں سے نصف رقم وہ گھر بھیجدیتا اور نصف میں بمشکل اپنی گزر کرتا ———

ادھر زہرہ خدا کے حضور میں اُسکی کامیابی کی دعائیں مانگ رہی تھی اور ادھر انور کی ماں بہن - - - - -

ہفتے گزرے ... ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے ایک سال گزر گیا - مگر ابھی تک وہ صرف ۱۰۰ ماہوار کا کلرک تھا - اُسکا دماغ پھر اُلجھنے لگا - "ایک سال" بس ایک سال کی مدت اور ہے اور ابھی تک وہ کچھ بھی نہ کر سکا - مگر وہ ہمت نہ ہارا تھا ———

پھر مہینے گذرنے لگے - اور یہاں تک کہ ۱۰ ماہ گزر گئے - ماں کی طرف سے کئی خطوط آچکے تھے - اور کبھی کبھی راشدہ کے خط میں ایک آدھ مختصر سا خط زہرہ کا بھی آجاتا! .... زہرہ کا خط انور کے لئے زندگی کا پیغام ہوتا تھا - مگر اب کی مرتبہ جو خط آیا تھا وہ بہت مایوس کن تھا - لکھا تھا -

صرف دو ماہ رہ گئے ہیں - خدانخواستہ اگر آپ ناکام رہے تو اپنی زہرہ کو ہمیشہ کیلئے کھو دیں گے - ابا جان زبان کے بڑے پابند اور ضدی آدمی ہیں - خدارا ہمت کیجئے -

خط پڑھکر انور کے آنسو ٹپک پڑے - "یا خدا میری مدد کر" وہ آسمان تکتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں بولا ——— اسوقت وہ بہت پریشان تھا - کام کاج میں جی نہ لگتا تھا - اسلئے ٹہلتا ہوا سمندر کے کنارے بندر پر چلا گیا ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے دعوت نشاط دے رہے تھے - مگر اُس کا دل اُداس تھا اور جب اُسے کئی کئی خوش حال جوڑے باہوں میں باہیں ڈالے تفریح کرتے دیکھے ورہ اپنی سرد آہ کو روک نہ سکا - .... وہ سب سے دور ... ایک ٹیلے کے قریب جا بیٹھا - اسوقت سورج دور مغرب میں - سمندر کے سینے میں ڈوب رہا تھا - اور انور کی اُداسی دم بدم بڑھتی جا رہی تھی - - - -

اچانک اُسے پشت سے کسی بھاری چیز کے سمندر میں گرنے کی آواز آئی کنارے پر بنی ہوئی سنگین بارہ دری سے کوئی پانی میں گر پڑا تھا - اور موجوں کے تھپیڑوں میں ڈوب اُچھل رہا تھا -

انور برداشت نہ کر سکا اور فوراً سمندر میں کود پڑا ساحل کچھ خاموش سا تھا وہ ڈوبنے والے کو بچا لینے میں کامیاب ہوگیا -

———

یہ بمبئی کے ایک مشہور سیٹھ ابراھیم بھائی تھے جو اپنی اہلیہ کے ساتھ تفریح ساحل فرما رہے تھے اور اتفاق سے پاؤں پھسل گیا تو گر پڑے -

وہ انور کے بہت ممنون ہوئے - بولے -

آپ نے میری جان بچا کر مجھے بڑا احسان کیا - میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں -" "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" وہ بہت اداس لہجہ میں بولا - مگر اوسکا دل اتنا بھ

آنسو لاکھ روکنے پر بھی ٹپک پڑے ۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا
مگر سیٹھ نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا ۔ "آپ میرے ساتھ چلئے ۔"
وہ نرمی سے بولے ۔

اور انور کے انکار پر بھی وہ نہ مانے ۔ اُسے موٹر میں
بٹھا کر گھر لے گئے ۔ انکی ہمدردیوں نے آخر انور کی زبان کھلوا
اور اُس نے سب کچھ بتا دیا ـــــ ابراہیم بھائی قہقہے مار کر
کہنے لگے ۔ ـــ "عجیب آدمی ہو تم بھی ۔ اتنی سی بات میں
اتنے مایوس ہو گئے تھے ۔ اچھا لڑکی کے باپ کو لکھدو کہ تم نے
انکی شرط پوری کر دی ہے ۔" وہ بولے ۔

"لیکن ۔" اس نے کہنا چاہا ۔

"میں جو کہہ رہا ہوں تم وہ کرو ۔ آج سے تم میری کمپنی
میں کام کرو گے ۔ تمہیں ایک ہزار روپیہ ماہوار ملے گا ۔ ٹھیک ہے نا ۔"
اُنھوں نے پوچھا ۔

"ایک ہزار ـــــ" انور نے حیرت سے انکا منہ
دیکھ کر کہا ۔

"ہاں ۔ اور تمہاری شادی کے سارے اخراجات کا بار
میں اٹھاؤں گا ۔ مجھے اپنا ہی سمجھو ۔"
سیٹھ نے اسکے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔

انور کا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا ۔ اُسنے اُسی دن
زہرہ کے والد کو لکھ بھیجا اور زہرہ کو بھی راشیدہ کی معرفت
ایک خط لکھ دیا کہ

خدا کی مہربانی سے سب ٹھیک ہو گیا ہے ۔ میں بہت
جلد آ کر تم سے ملوں گا ۔ ـــــ

اسی ہفتے ابراہیم بھائی انور کو لیکر روانہ ہو گئے ۔
اور دو ہفتوں کے بعد جب واپس لوٹے تو اُن کے ساتھ انکی
بہو بھی تھی ـــ زہرہ ـــ انور کو انھوں نے اپنا منہ بولا
بیٹا بنا لیا تھا ۔

"مرے حضور کیوں؟"

اکرم الٰہ آبادی

یہ زندگی کا زیر و بم یہ اونچی نیچی منزلیں
یہ رفعتیں یہ کھائیاں، یہ جھمگٹے یہ محفلیں

مگر یہ اتنا فرق کیوں کہ زندگی کو زندگی
ہڑپ رہی ہے۔ کھا رہی ہیں ناگنوں کو ناگنیں

کہیں اندھیرے جھونپڑے اداس اداس جھاڑ ہیں
کہیں قصورِ ہفت در میں برق سوز مشعلیں

کہیں کوئی تڑپ رہا ہے آرزوئے موت میں
کہیں ابھرتی جا رہی ہیں زندگی کی دھڑکنیں

یہ کم تری یہ برتری یہ اونچ نیچ و فرق کیوں
یہ کیوں کسی کو راحتیں یہ کیوں کہیں مصیبتیں

نظامِ کائنات میں یہ اتنا انتشار کیوں
یہ ٹوٹتی ہیں بجلیاں زمیں پہ بار بار کیوں

عجیب جائے ہاؤ ہو ہے عالمِ بسیط بھی
کہیں ہیں نالہ ہائے غم، کہیں ہیں مسکراہٹیں

بلند ہاتھ بخت کا بلند پایہ تخت کا
شکستہ بام و در، کہیں سسکتی روتی قسمتیں

گھٹی گھٹی سی ہچکیوں میں فاقہ مستوں کی گونج
سجی سجی سی محفلوں میں قہقہوں کی بارشیں

عجیب اک مذاق ہے یہ رزمگاہِ کائنات
جبینِ آسماں پہ جیسے بادلوں کی سلوٹیں

ملا نہ کیوں ہر اک بشر کو اک مساویانہ حق
بٹیں نہ کیوں برابر ہی سے زندگی کی نعمتیں

فلک کو چومتے محل۔ رہیں آفتوں سے دور کیوں
غریب پر ہی تنگ ہے جہاں "مرے حضور کیوں؟"

تنقید و تقریظ

قمر ہاشمی

سرمایہ داری

سالک الہاشمی اُن نوجوان شعراء میں سے ہیں جو ادب برائے حیات کے قائل ہیں۔ اُن کی جدید شاعری نئی قدروں کی ضامن ہے اور اُن کا دھڑکتا ہوا دل اور اوس کی دھڑکنیں بیکسوں کے مصائب کی ترجمان ہیں۔ اُنہیں اپنے وطن سے بے انتہا محبت ہے اور ابنائے وطن سے بے پایاں اُنس۔ جہاں وہ اپنے مفلوک الحال وطن کی مجروح چیخوں اور سسکتی ہوئی آوازوں کو سُنتے ہیں۔ وہیں اس کی خوشحالی کے سچے خواب بھی دیکھتے ہیں اور خلوص دل کے ساتھ اُن کے درد کے درمان کی تلاش کرتے ہیں۔

سرمایہ داری اُسی فن کار کا ایک بلند کارنامہ ہے مجموعی حیثیت سے اگر سرمایہ داری کو دیکھا جائے تو وہ دنیا کے سربراوردہ ممالک کی اقتصادی تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اگر اس کتاب کو سرمایہ دار ممالک کے مزدوروں کی (Encyclopaedia) کہا جائے تو بیجا نہیں۔

سرمایہ داری میں فاضل مصنف نے انگلستان، اٹلی، فرانس، جرمنی، ترکی، روس، امریکہ، جاپان اور ہندوستان کے معاشی حالات بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ سرمایہ دار مزدوروں پر کیا کیا مظالم کرتے ہیں۔ اور کس کس طرح اُن کا خون چوستے ہیں۔ اُن کو پوری مزدوری نہیں دیتے۔ غریب مزدور کی "برات" "شاخ آہو" پر رہتی ہے اور سرمایہ دار اُس کو "برگ حشیش" بھی دیتا ہے۔ تو وہ "قند نبات" سمجھتے ہیں اور اس محنت کش طبقہ کو اس کی اصل اُجرت کا عُشر عشیر بھی نہیں ملتا ؎

دست دولت آفریں کو مزد یُوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

(اقبالؒ)

سالک الہاشمی ایک حساس دل کے مالک ہیں۔ جو غریبوں کی ذراسی مصیبت پر موم ہو جاتا ہے۔ اُنہیں غریبوں اور مزدوروں سے محبت ہے اور وہ ایک سچے ہندوستانی کی طرح اپنے وطن کے پرستار ہیں۔

یہاں کے مزدور کی حالت اور ہندوستان کے تڑپا دینے والے واقعاتِ حزیں کو مصنف کی زبانی سُنئے۔

"ہندوستان کا افلاس، یہاں کی بے روزگاری اور بے چینی بہت تکلیف دہ ہے اور یہ حالت روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے، میں تو ہندوستان کی حالت پر غور کرتے وقت بہت آنسو بہاتا ہوں مگر افسوس مجھ سا کمزور لیکن حقیقت آشنا دردمند اور مجبور، جذبات سے بھرا ہوا لیکن بھائیوں کی امداد کے لئے کیسۂ زر سے خالی رونے والا مگر کام کے لئے تیار اور حساس دل ہر ایک پہلو میں نہیں۔

ملکی و بیرونی سرمایہ داری ہندوستان کی حالت روز بروز بدتر کئے دے رہی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان کی حالت بہت زبوں اور رلا دینے کے لئے کافی ہے، بکرما دیت، یشودھرمن، رانا پرتاپ، علاؤالدین، اکبر اعظم، نادر، اورنگ زیب عالمگیر جیسے جلیل الشان بادشاہوں کی بھارت

نیا روپ دیکھ کر آنسو نکل پڑتے ہیں "

آخر میں وہ مجبور ہو کر ہندوستان کی ننگی لاش کو دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں اور کمیونسٹ پارٹی کے جلیل القدر و مخلص کارکن کامریڈ مخدوم محی الدین کی زبان سے بول اٹھتے ہیں ؎

ایک ننگی لاش ہے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں تھتھری ہوئی
ایک قبرستان جسمیں ہوں وہاں کچھ بھی نہیں
ایک بھٹکی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائیگا
ایک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائیگا

سالک الہاشمی نے کانپور میں رہ کر مزدوروں کی حالت دیکھی ہے۔ مزدوروں سے ملتے جلتے رہے ہیں اور ان کے جذبات واحساسات کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور اسی فضا میں سانسیں لی ہیں "قلیل تنخواہ، گندے اور خراب مکانات گندی فضا، فاقہ کشی، زیادہ کام، کم معاوضہ، اریسٹ اور بے کاری سے مزدوروں کی صحتیں خراب اور تندرستیاں برباد ہو جاتی ہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کا مزدور ایک مٹھی چاول کھا کر بہت کام کر سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے، اس کی اجرت زیادہ نہ ہونی چاہئے ان عقل کے اندھوں سے یہ کہا جائے کہ جب اسے کھانے کو بھی پوری طرح نصیب نہیں ہوتا تو وہ کیا مزدوری کر سکتا ہے اور زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ اس کی بھوک اور اہل و عیال کا خیال ہے جو اسے بھوکا رکھ کر بھی سخت کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور ایک مٹھی چاول کھا کر وہ جفاکشی کرتا ہے۔

وہ سرمایہ داری ہی سے متنفر نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں سے بھی نفرت کرنے لگتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ سرمایہ دار مزدور کے لئے جونک سے کم نہیں جو مزدور کے جسم سے اس کے آخری خون کا قطرہ بھی چوس لینے کے لئے آمادہ رہتا ہے چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں

"سرمایہ دار اپنے فائدوں کو مدنظر رکھکر مزدوروں کو آپسمیں لڑا دیتے ہیں، شورشیں پھیلاتے ہیں اور اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے کے لئے ان لوگوں سے مخالفین کے جذبات بھڑکا دیتے ہیں اور کئی طریقوں سے یہ التزام کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مزدور متحد نہ ہوں کیونکہ ایسی حالت میں بہت ممکن ہے یہ لوگ "بندگی" اور "جی حضوری" کا جوا اپنے کاندھے سے اتار پھینکیں"۔

ان حقائق کے ساتھ زبان کی پاکیزگی اور لطافت بیان پر بھی پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ کتاب کے بعض حصص دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سالک الہاشمی شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ میں "سرمایہ داری" کا ایک ورق پیش کرتا ہوں۔ جس سے آپ کو مصنف کی ادیبانہ شوکت عظمت کا اندازہ ہوگا۔ وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں کہ وہ زمانہ دور نہیں جب مزدور اٹھیگا اور اس کے مطالبات پورے ہوں گے۔ وہ سرمایہ داروں کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ وہ ہزاروں آندھیاں اپنے ساتھ لائے گا اور خواجگی کے چراغ کو گل کر دے گا، سرمایہ داروں کے مظالم کا ردعمل (D i lee tie Reac tion.) یہی ہو بھی سکتا ہے کہ ایک بار مزدور اٹھے اور جاگیردارانہ نظام کو تہس نہس کر دے اور ایک "جہان نو" کی بنا ڈالے۔ الفاظ کا رچاؤ، بندش کی خوبیاں اور بیان کی لطافت ملاحظہ ہو:-

"کسان اور ادنیٰ طبقے کے لوگ حکومت، ساہوکار، زمیندار، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور ایسے ہی بہت سے "ساہوکاروں" اور "ٹھیکہ داروں" کے مظالم برسوں سے کسی کہ

برداشت کرتے رہے لیکن اب وہ زمانہ دور نہیں جب کسان اپنے
بھی بھائی مزدوروں سے ملکر اپنے ہمدردوں کو ساتھ لے کر
اٹھیگا اور اس فرعونی نظام کے لئے موسیٰ بنے گا کیونکہ
وہ بہت ظلم برداشت کرچکا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے
بھائی بھی دکھی ہیں، یہ سب دکھی ہی اپنے اور دوسروں کے سکھ
کے لئے اپنے ہمدردوں اور مساوات و شرافت کا گیت گانے
والوں اور نیک دل جوانوں کو لے کر اٹھیں گے اور طوفان
بن کر جہازِ سرمایہ داری کو ڈبودیں گے باد تند بن کر خوابگی کے
ٹمٹماتے چراغ کو گل کردیں گے۔ بیل بدمست کے روپ اختیار
کرکے قصرِ استبداد کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے اور ایک ہی
دنیا بساکر رہیں گے جسمیں "شرافت و محبت" کا دریا یقین و
عمل" کے وادیوں سے بہہ کر "بیداری و حریت" کا نمونہ بناتا
رہے، جس میں "یزدان" کی عزت اور "اہرمن" کی حقارت
ہو جس میں "تلوار کی جھنکار" ہر وقت "پیغام عمل" دیتی
رہے جس کا ہر ذرہ آزادی بدوش و جوش بداماں ہو جہاں
انسان "آغوشِ فنا" میں پل کر "بقائے دوام" حاصل کرے
جہاں قومیت کی مضبوط ناؤ "وطنِ مقدس" کے طوفانی دریاؤں
میں بھی نہ رکے جہاں "سنان و پیکان" درسِ شجاعت"
دیں اور "توپوں" اور "بموں" سے آواز آتی رہے کہ اے
جاں نثارانِ وطن۔ اے نوجوان قوم، قوم و وطن کی سیوا
تمہارے ہاتھ میں ہے جہاں "جذبات خودداری" اغیار کی
نحوست" کو پارہ پارہ کردیں، جہاں حبابِ زندگی "بھنور
میں پھنس کر بھی شانِ بے نیازی سے مسکراتا رہے جہاں
خرمن ہستی" "تمغاع برق سے آنکھ لڑاتا رہے جہاں جوان
ہمت لوگ "تدبیر و عمل" کی تلواریں لیکر وطن کی سرزمین
معصوم کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہادیں ؎

خاک کے سینے میں پنہاں ہیں دبی چنگاریاں
جاگ اٹھیں گی کبھی سوئی ہوئی خودداریاں
کانپ جائے گا کبھی قصرِ تمدن کا چراغ
موم کے مانند پگھلیگا امیری کا دماغ
یہ زمیں ہل جائیگی یہ آسماں ہل جائیگا
اک "دنیا پرچم" ہواکے دوش پر لہرائیگا

جاں نثار اختر (علیگ)

کتاب کے آخری بابوں میں فاضلانہ طور پر کارل مارکس
کا نظریہ حیات پیش کیا گیا ہے۔ فسطائیت
(Fascism) اشتراکیت (socialism)
اور اشتمالیت (communism) پر مفصل بحث کیگئی
ہے۔ فسطائیت (Fascism) اور سرمایہ داری۔
(capitalism) کا حل بتایا گیا ہے۔ اور
مصنف نے کچھ اپنے نظریات پیش کئے ہیں اور مبسوط طریقے سے
بتایا ہے کہ روس کا نظام معاشرت کسقدر پاکیزہ ہے۔ وہاں کا کسان
مرفہ الحال ہے اور مزدور عیش و مسرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ وہاں
کسی انسان کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی (
(communism) کے بلند اصولوں پر روس میں اشتراکی
نظام خوش اسلوبی کیساتھ چلرہا ہے، تمام مزدور ملجلکر کام کرتے ہیں
مزدوروں کی بڑی بڑی انجمنیں اور سرمایہ داری ادارے ان کے حقوق
کے تحفظ کے قوانین بناتے ہیں، ان کے آرام اور انکی آسائشوں
کے تمام سامان مہیا کئے جاتے ہیں، کام سب پر برابر برابر تقسیم کیا جاتا ہے
(Labour اور Time) میں کسی کی اجارہ نہیں اور
اور سرمایہ کسی کی ملکیت نہیں۔ جہاں مزدور کے آرام اور اسکی ضروریات
کو بزور قانون پورا کیا جاتا ہے۔

غرض موجودہ زمانے میں "مزدور سرمایہ دار" پر ہماری نظر سے
اس سے اچھی کتاب نہیں گزری "سرمایہ داری" گندی ذہنیت رکھنے
والے (capitalists) کے لئے تازیانہ ہے"! مزدوروں
کیلئے "آیۂ رحمت ہے"!! اور سیاستِ حاضرہ کی تاریخ نشاۃ الثانیہ!!!

سرمایہ داری کے ناشر سید محمد ہاشم پروپرائٹر الہ آباد پبلشنگ ہاؤس
الہ آباد ہیں کتابت و طباعت اعلیٰ ہے اور عمدہ ٹائٹل کے ساتھ
تین سو صفحات پر مشتمل ہے، فائن ڈسٹ کور قیمت (عہ)

[illegible]

(ہم قابل مصنف کو اس عمدہ پیشکش پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں [illegible] کہ ان کا قلم اسی طرح فکر اور بلند نظر ہمیشہ ملک و قوم کی رہبری

سرشار صدیقی

دھڑکنیں

(زیر ترتیب مجموعہ "سکونِ راز" کی ایک فکر)

لٹ گئی گلوں کی جب تازگی و برنائی
پھر یہ کیوں چمن نکھرا، پھر یہ کیوں بہار آئی

کیا بتاؤں کیا شے تھی میری آبلہ پائی
خود تڑپ اٹھی منزل اور مرے حضور آئی

زندگی سے گھبرا کر موت مانگنے والے!
اور ہاں اگر تجھکو موت بھی نہ راس آئی

شانِ بے نیازی کی یہ بھی کوئی منزل ہے
خود بچا گیا دامن جب وہ میرے پاس آئی

کسکی نیم باز آنکھیں اٹھ گئیں مری جانب
کوئی جیسے نس نس میں لے رہا ہو انگڑائی

ہائے اس چمن بھر میں ایک پھول کی قسمت
جس نے ایک کمسن کی گود میں جگہ پائی

جب سے کوئی چھوٹا ہے عین موسمِ گل میں
پھر نہ کھل سکے غنچے اور نہ پھر بہار آئی

دیکھ لے مشیت کی طرفہ کاریاں ہمدم
ایک پھول کمھلایا، ایک کو ہنسی آئی

پاس آتے ہی منزل ہو گئے قدم بوجھل
ہائے میری ناکامی، ہائے میری پسپائی

ناصحا مبارک ہو تیرے نام لیتے ہی
دیکھ وہ اٹھے بادل، دیکھ وہ گھٹا چھائی

تیز ہو گئی ہیں کچھ دل کی دھڑکنیں سرشار
یا کسی نے یاد کیا، یا کسی کی یاد آئی

شاہ وحید صدیقی

ریل کی سیٹیاں

چھک ۔ چھک ۔ چھک ۔ چھک ۔ ریل کے انجن کی بے درد آواز رات کے سناٹے میں فضا میں پھیل رہی تھی ۔

ریل کی سیٹی کی آواز بجلی کی طرح اس کے کان کے پردہ پر گری ۔ اس نے ایک کروٹ لی ۔ مست شباب کی رنگینیوں اور حسرت و یاس کے ہنگاموں سے برپا انگڑائی کے ساتھ اٹھ بیٹھی ۔ جسم پر تار تار کپڑے تھے ۔ ملائم روئی کا گالہ جیسا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا ۔ کپڑے کی دھجیاں جسم سے چپکی ہوئی تھیں ۔ اسکی حسین جبین سے پسینے کے موتی ڈھلک کر دونوں زانو کے درمیان آغوش میں آگئے ۔ وہ پھر اپنی داہنی بازو کا ٹیکا لیتے داہنے رخ لیٹ گئی ۔

اس کا ابھرا ہوا سینہ زور سے ہلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے احساس جسم میں برقی لہریں دوڑ جاتی تھیں ۔ وہ تفکرات کی دنیا سے بہت دور ہو گئی ۔ اس کے چہرہ پر خوشی اور آنکھوں میں نورانی جھلکیں تھیں ۔ وہ اس لطف و سکون کی حالت کو زیادہ دیر تک طاری نہ رکھ سکی ۔ ایک جا جمع شدہ خیالات ٹوٹے ہوئے ۔ کی طرح بکھر کر منتشر ہو گئے ۔ اسکی آنکھوں کی چمک دمک اسکے چہرہ کا حسن چھپ گیا ۔ آنکھوں میں قطرے کانپ رہے تھے ۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ اس نے ایک تصویر نکالی اور محبت بھری نگاہیں اس پر ٹکٹکی جمادیں ۔ منتشر شدہ خیالات اس تصویر میں جذب ہو گئے ۔ وہ بار بار اسکو بار [illegible] اور فضاؤں پر بھرتی ۔ مسکرا کر دیکھ رہی تھی

ہو رہی تھی ۔ تصویر یکایک اسکے ہاتھ سے چھٹی اور اسکے سینے پر آ رہی ۔ اسکی ابھری ابھری چھاتیاں تصویر کے گرنے سے ایک لمحہ کیلئے دبیں اور پھر ابھر آئیں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بوجھ تصویر پر ڈال دیا ۔ اور اس کو دباتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے بے خبر ہو گئی ۔

دنیا کے سارے تفکرات جذبات کے طوفان میں بہہ گئے مفلسی کا شکوہ اور امیری کی خواہش اسکی گرم سانسوں کے ساتھ بخارات بن کر اس سے بہت دور فضا میں پھیلتے نکل گئے ان لمحات میں دنیا کا ظلم و رحم اس کے لئے لذت میں بدل گیا اسی حالت میں ریل کی زور کی سیٹی نے اس کے کان کے پردوں کو دھکے دئے ۔

وہ پھر تفکرات کی دنیا میں گھر گئی ۔ چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی ۔ بتی کی دھیمی روشنی میں دیواریں نظر آ رہی تھیں دیوار کا کوئی حصہ صاف نہ تھا ۔ ہر حصہ کھردرا اور جیبہ جیبہ میں باریک باریک سوراخ تھے ۔ وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے دل کے زخم گن رہی ہو ۔

یکایک اس کی نظر اپنی بیوہ ماں اور معصوم بھائیوں پر پڑی ۔ اسکی ماں گہری موت کی سی نیند سو رہی تھی ۔ چھوٹے معصوم بھائی ۔ چیتھڑے باندھے ننگے دھڑنگے پڑے تھے اس کا دل بھر آیا ۔ دل و جگر رگ و ریشہ میں ان کی سلامتی و آسودگی کی دعائیں ہر سانس کے ساتھ شریان کی رو سے دل کے ساتھ جسم میں پھیلتی جا رہی تھیں ۔ اسکی نگاہیں

ں ان کے معصوم چہروں میں جذب ہوجاتیں ۔ تو کبھی
ے تار تار نقشی چیتھڑوں میں چھپ جاتیں ۔ اب
سہہ نہ سکی ۔ گھبرائی آنکھوں سے اپنی ماں اور بھائیوں کو
تی اُٹھ کھڑی ہوگئی ۔ رات کی سنسان حکمرانی میں
کے قدم چپ چاپ دروازہ کی طرف بڑھے ۔ پہلا پیر
وازہ کے باہر ڈال چکی تھی کہ دوسرا پیر وہیں گڑا رہا ۔
پیر پھیرے وہیں کھڑی رہ گئی ۔ اپنی بیوہ ماں اور
صوم بھائیوں کی زندگی کے خیالات نے اس کے دوسرے
م کو زنجیروں سے جکڑ دئے تھے ۔

وہ دروازے کی دہلیز سے باہر کا پیر اُٹھالینا
ہتی تھی لیکن وہ ایسا نہ کرسکی ۔ جیسے اسکے پریمی کی محبت
اتوی کڑیاں پڑی تھیں کہ اس کے پیر پھر دروازے کے
درنہ ہوٹ سکے ۔ وہ اب اسی کشاکشی میں تھی ۔ اسکی
کھوں میں ماں بھائی پھر رہے تھے ۔

"ماں کو چار روز سے بخار آرہا ہے تین روز تو
بخار ہی کی حالت میں مزدوری کو گئی ۔ وہ مجبور تھی ۔
ر ایسا نہ کرتی تو معمول کا آدھا پیٹ کھانا بھی مجھکو اور
رے معصوم بھائیوں کو حرام ہو جاتا ۔ اسے تو خود جیسے
نا پیٹ ہی نہیں ہے ۔ دن میں ایک دفعہ صبح کھاتی ہے
دھی کچی پکی جوکی بھدی روٹی جا ۔
آج تو خوب بخار چڑھ گیا ۔ اُٹھنے بیٹھنے کی بھی
ہمت نہیں ۔ مزدوری کو کہاں جاسکتی ۔ آج رات تو سب
وکے سوگئے ۔"

وہ ان خیالات میں تھی کہ اتنے میں ریل کی سیٹی
کا ایک زور کا مکا اسکے ابھرے سینے پر پڑا ۔ اب وہ ایک
جھٹکے میں ایک ہی سانس میں دروازے کے باہر تھی ۔

چاند تاروں کو جیسے لوریاں دے رہا تھا ۔ اور
تارے یکے بعد دیگرے نیند میں غائب ہوتے نظر آرہے تھے ۔
گرما کے دم گھٹنے سکوت کو توڑ نے دیہاتی ہوا کے جھونکے چلنے
شروع ہوئے ۔ وہ بھاگ رہی تھی ۔ سینہ اُچھل رہا تھا ۔
دل کچھ کہہ رہا تھا ۔ آنکھیں دیکھ رہی تھیں ۔ مخالف سمت کی
ہوا کے جھونکوں سے پھٹے ہوئے کرتے کی دھجیاں پیروں کے
بیچ چیکتی لہراتی جارہی تھیں ۔ گاڑھا لہنگا پنڈلیوں تک
غبارہ بن کر اُٹھ رہا تھا ۔ پنڈلیوں کی رگیں ہر قدم کے
اُٹھنے کے ساتھ اُبھر اُبھر کر آرہی تھیں ۔ کرتے کی آستینوں
کی دھجیاں اعزازی پٹیاں بن کر اُڑ رہی تھیں ۔ ہوا کے
سرد جھونکے بغلوں سے ٹکرا کر گدگدا دے رہے تھے ۔ اسکے
لمبے لمبے بال چوٹی کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک جال سا
بنا رہے تھے ۔

یہ بالوں کا جال اسکے پیچھے پیچھے ایسا اڑا جارہا تھا ۔
جیسے اسکو پھانسنے کیلئے تعاقب ہورہا ہو ۔ ہوا کے
جھونکوں سے اسکی پلکیں جھک جاتیں آنکھیں اسکی زد
کھاتیں اور بند بند ہوجاتیں اسکے پیر سخت پتھر پر تھرکتے
تھرکتے تھک چکے تھے ۔ تیز رفتاری میں ماند پڑتی جارہی
تھی ۔ اب وہ ایک صاف سڑک پر تھی ۔ بغور دیکھتے
ہوئے وہ عالیشان محلات کے سامنے سے گذر رہی تھی ۔
انھیں دیکھ کر اس کے جذبات کا طوفان اُمنڈ اُمنڈ کر
آنے لگا ۔ "میری بھی کوئی زندگی ہے ۔ دن بھر مزدوری
کرتے کرتے ہاتھ تھک جاتے ہیں ۔ پیر درد دیتے ہیں ۔ سارا دن
سورج کے تلے کٹتا ہے ۔ دوپہر تو مجھے پسینہ میں نہلا دیتی ہے
راستہ چلنے والے میرے بھیگے ہوئے بدن کو گھور گھور کر دیکھتے
ہیں ۔ جیسے مجھے چور سمجھ کر نگاہوں سے میری جھڑتی
لیتے ہوئے میرے پھٹے کرتے کے اندر کسی چیز کی تلاش کررہے ہیں ۔
آہ! کیسے ہیں لوگ ۔

جب میرے بال سامنے اور پیچھے بے ترتیب گرتے ہیں تو
وہ مجھے ٹک ٹک دیکھتے ہیں ۔ میرے پاؤں میں دنیا بھر کا کوڑا
کرکٹ ہے بھی تو انہیں کیا ۔ وہ کیوں مجھے ڈھونڈتی نظروں
سے دیکھتے ہیں ۔ کیا میں نے کوڑا کرکٹ بھی چرایا ہے ۔

شاہ وحید صدیقی

ریل کی سیٹیاں

چھک ۔ چھک ۔ چھک ۔ چھک ۔ ریل کے انجن کی بے درد آواز رات کے سناٹے میں فضا میں پھیل رہی تھی ۔

ریل کی سیٹی کی آواز بجلی کی طرح اس کے کان کے پردہ پر گری ۔ اس نے ایک کروٹ لی ۔ مست شباب کی رنگینیوں اور حسرت و یاس کے ہنگاموں سے بھرپور انگڑائی کے ساتھ اٹھ بیٹھی ۔ جسم پر تار تار کپڑے تھے ۔ ملائم روئی کا گالا جیسا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا ۔ کپڑے کی دھجیاں جسم سے چپکی ہوئی تھیں ۔ اسکی حسین جبین سے پسینے کے موتی ڈھل کر دونوں زانو کے درمیان آغوش میں آگئے ۔ وہ پھر اپنی داہنی بازو کا ٹیکا لیتے داہنے رُخ لیٹ گئی ۔

اس کا اُبھرا ہوا سینہ زور سے ہلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے احساس جسم میں برقی لہریں دوڑ جاتی تھیں ۔ وہ تفکرات کی دنیا سے بہت دور ہو گئی ۔ اس کے چہرہ پر خوشی اور آنکھوں میں نورانی جھلکیں تھیں ۔ وہ اس لطف و سکون کی حالت کو زیادہ دیر تک طاری نہ رکھ سکی ۔ ایک جا جمع شدہ خیالات ٹوٹے ہوئے ... کی طرح بکھر کر منتشر ہو گئے ۔ اسکی آنکھوں کی چمک دمک اسکے چہرہ کا حسن چھپ گیا ۔ آنکھوں میں قطرے کانپ رہے تھے ۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ اس نے ایک تصویر نکالی اور محبت بھری نگاہیں اس پر ٹک جما دیں ۔ منتشر شدہ خیالات اس تصویر میں جذب ہو گئے ۔ وہ بار بار اسکو پیار کرتی اور اپنے رخساروں پر پھیرتی ۔ اسکو گدگدی سی ہو رہی تھی ۔ تصویر یکایک اسکے ہاتھ سے چھٹی اور اسکے سینے پر آرہی ۔ اسکی اُبھری ابھری چھاتیاں تصویر کے گرنے سے ایک لمحہ کیلئے دبیں اور پھر ابھر آئیں اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بوجھ تصویر پر ڈال دیا ۔ اور اس کو دباتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے بے خبر ہو گئی ۔

دنیا کے سارے تفکرات جذبات کے طوفان میں بہہ گئے مفلسی کا شکوہ اور امیری کی خواہش اسکی گرم سانسوں کے ساتھ بخارات بن کر اس سے بہت دور فضا میں پھیلتے نکل گئے ان لمحات میں دنیا کا ظلم و رحم اس کے لئے لذت میں بدل گیا اسی حالت میں ریل کی زور کی سیٹی نے اس کے کان کے پردوں کو دھکے دئے ۔

وہ پھر تفکرات کی دنیا میں گھر گئی ۔ چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی ۔ بتی کی دھیمی روشنی میں دیواریں نظر آرہی تھیں دیوار کا کوئی حصہ صاف نہ تھا ۔ ہر حصہ کھردرا اور جیبہ جیبہ میں باریک باریک سوراخ تھے ۔ وہ انہیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی جیسے دل کے زخم گن رہی ہو ۔

یکایک اس کی نظر اپنی بیوہ ماں اور معصوم بھائی پر پڑی ۔ اسکی ماں گہری موت کی سی نیند سو رہی تھی ۔ چھوٹا معصوم بھائی ۔ چیتھڑے باندھے ننگے دھڑنگے پڑے تھے اس کا دل بھر آیا ۔ دل و جگر رگ و ریشہ میں ان کی سلامتی و آسودگی کی دعائیں ہر سانس کے ساتھ شریان کی رو سے مل کر اسکے سارے جسم میں پھیلتی جا رہی تھیں ۔ اسکی نگاہیں

کبھی ان کے معصوم چہروں میں جذب ہو جاتیں۔ تو کبھی ان کے تار تار نقشی چیتھڑوں میں چھپ جاتیں۔ اب وہ سہہ نہ سکی۔ گھبرائی آنکھوں سے اپنی ماں اور بھائیوں کو دیکھتی اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ رات کی سنسان حکمرانی میں اسکے قدم چپ چاپ دروازہ کی طرف بڑھے۔ پہلا پیر دروازہ سے باہر ڈال چکی تھی کہ دوسرا پیر وہیں گڑا رہا۔ وہ پیر چیرے وہیں کھڑی رہ گئی۔ اپنی بیوہ ماں اور معصوم بھائیوں کی زندگی کے خیالات نے اس کے دوسرے قدم کو زنجیر سے جکڑ دئے تھے۔

وہ دروازے کی دہلیز سے باہر کا پیر اُٹھا لینا چاہتی تھی لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ جیسے اسکے پریمی کی محبت کی قوی کڑیاں پڑی تھیں کہ اس کے پیر پھر دروازے کے اندر نہ ہوٹ سکے۔ وہ اب اسی کشاکشی میں تھی۔ اسکی آنکھوں میں ماں بھائی پھر رہے تھے۔

"ماں کو چار روز سے بخار آرہا ہے تین روز تو وہ بخار ہی کی حالت میں مزدوری کو گئی۔ وہ مجبور تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو معمول کا آدھا پیٹ کھانا بھی مجھکو اور میرے معصوم بھائیوں کو حرام ہو جاتا۔ اسے تو خود جیسے اپنا پیٹ ہی نہیں ہے۔ دن میں ایک دفعہ صبح کھاتی ہے آدھی کچی پکی جوکی بھدی روٹی۔

آج تو خوب بخار چڑھ گیا۔ اُٹھنے بیٹھنے کی بھی سکت نہیں۔ مزدوری کو کہاں جا سکتی۔ آج رات تو سب بھوکے سو گئے۔"

وہ ان خیالات میں تھی کہ اتنے میں ریل کی سیٹی کا ایک زور کا مکا اسکے ابھرے سینے پر پڑا۔ اب وہ ایک جھٹکے میں ایک ہی سانس میں دروازے کے باہر تھی۔

چاند تاروں کو جیسے لوریاں دے رہا تھا۔ اور تارے یکے بعد دیگرے نیند میں غائب ہوتے نظر آرہے تھے۔ گرما کے دم گھٹتے سکوت کو توڑنے دیوانی ہوا کے جھونکے چلنے شروع ہوئے۔ وہ بھاگ رہی تھی۔ سینہ اُچھل رہا تھا۔ دل کچھ کہہ رہا تھا۔ آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ مخالف سمت کی ہوا کے جھونکوں سے پھٹے ہوئے کرتے کی دھجیاں پیروں کے بیچ چپکتی لہراتی جا رہی تھیں۔ گاڑھا لہنگا پنڈلیوں تک غبارہ بن کر اُٹھ رہا تھا۔ پنڈلیوں کی رنگین ہر قدم اُٹھنے کے ساتھ اُبھر اُبھر کر آرہی تھیں۔ کرتے کی آستینوں کی دھجیاں اعزازی پٹیاں بن کر اُڑ رہی تھیں۔ ہوا کے سرد جھونکے بغلوں سے ٹکرا کر گدگدا دے رہے تھے۔ اسکے لمبے لمبے بال چوٹی کی بندشوں سے آزاد ہو کر ایک جال سا بنا رہے تھے۔

یہ بالوں کا جال اسکے پیچھے پیچھے ایسا اڑا جا رہا تھا۔ جیسے اسکو پھانسنے کیلئے تعاقب ہو رہا ہو۔ ہوا کے جھونکوں سے اسکی پلکیں جھک جاتیں۔ آنکھیں اسکی زد کھاتیں اور بند بند ہو جاتیں اسکے پیر سخت پتھر پر تھرکتے تھرکتے تھک چکے تھے۔ تیز رفتاری میں ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اب وہ ایک صاف سڑک پر تھی۔ بغور دیکھتے ہوئے وہ عالیشان محلات کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر اس کے جذبات کا طوفان اُمنڈ اُمنڈ کر آنے لگا۔ "میری بھی کوئی زندگی ہے۔ دن بھر مزدوری کرتے کرتے ہاتھ تھک جاتے ہیں۔ پیر درد دیتے ہیں۔ سارا دن سورج کے تلے کٹتا ہے۔ دوپہر تو مجھے پسینہ میں نہلا دیتی ہے راستہ چلنے والے میرے بھیگے ہوئے بدن کو گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ جیسے مجھے چور سمجھ کر نگاہوں سے میری جھڑتی لیتے ہوئے میرے پھٹے کرتے کے اندر کسی چیز کی تلاش کرتے ہیں۔ آہ! کیسے ہیں لوگ۔

جب میرے بال سامنے اور پیچھے بے ترتیب گرتے ہیں تو وہ اُسے تک تک دیکھتے ہیں۔ میرے پاؤں میں دنیا بھر کا کوڑا کرکٹ ہے بھی تو انہیں کیا۔ وہ کیوں مجھے ڈھونڈتی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا میں نے کوڑا کرکٹ بھی چرایا ہے۔

کیا میں چور ہوں — مجرم — گناہگار — ذلیل
شاید میں چور ہوں - میں نے دنیا سے مفلسی چرائی ہے -
آہ یہ سب کچھ سہنے کے بعد مزدوری کیا ملتی ہے - دو ہاتھ
دو پیر لیتے جارہی تھکن — لیکن میں آنے - افواہ - یہیں
آدمی کی تھکن جلد تھوڑی ہی چلی جاتی ہے - سارا جسم درد
دیتا رہتا ہے - گال سرخ سوکھے کباب ہو جاتے ہیں -
افوہ کسی میں تھک جاتی ہوں - بوٹی بوٹی درد دینے لگتی ہے
بمشکل ہر نوالہ پر پانی کا گھونٹ لیتے آدھی روٹی ختم کرتی
ہوں - اور جلد اپنے بورے پر لڑھک جاتی ہوں - چھت
پڑے تکلیف و راحت کی ملی جلی آمیزش سہتے سہتے بہت جلد
مصائب کی دنیا سے دور ہو جاتی ہوں - کتنی میری گہری
نیند ہوتی ہے - جب آنکھ کھلتی ہے تو سوئی تھی ویسے ہی
چت پیر پھیلائے پڑی ہوتی ہوں -

میرے پھٹے کپڑے بھیگ جاتے ہیں - یہ میری
محنت کا پسینہ ہوتا ہے - دن بھر محنت کرکے سڑک پر پسینہ
گراتی ہوں - اور رات بھر تھکاوٹ سے خاموش جنگ
کرتے ہوئے کپڑے پسینہ سے تر کر دیتی ہوں -

اس کو نہایت قریب سے ریل کی بھیانک سیٹی سنائی
دی - اسکے خیالات رو میں اس سے بہت دور نکل گئیں -
اور دوسری رووں نے ان کی جگہ لے لی - اس کے قدم
اب ہوا کی طرح نہایت تیز صاف سڑک پر سلک رہے تھے
اس کو ڈر تھا کہ کہیں اس کے پیچھے سے پہلے ریل نہ چلی جائے
اس کے خیالات میں دوسری آئی ہوئی غالب روئیں
یہ تھیں کہ مجھکو اب دنیا سے کیا لینا ہے ؟
کچھ بھی تو نہیں - نہ محبت - نہ دل - نہ راحت
یہ سب تو میرے پریمی کے ساتھ چلے گئے - تو پھر میں زندگی
کے خلا میں کیوں جیئوں -

اب میں وہیں اسی اسٹیشن کو جا رہی ہوں جہاں
سے تمہاری اور میری زندگی کا ایک افسانہ شروع ہوا -
وہیں تم نے میرا دل خریدا تھا اور اسکا انمول قیمت ہزاروں
مسرتیں دیں - تم افسانہ ادھورا چھوڑ گئے مجھ سے دور -
اس جلتی پھرتی بستی سے دور ایک خاموش آبادی میں
بس گئے - میں آج خوشی خوشی تمہارے ادھورے افسانہ کو
پورا کرتے ہوئے تمہاری خاموش بستی میں آ رہی ہوں -
ریل اب اس کے نہایت قریب سامنے آتی جا رہی تھی
اس کے پیر تیز تیز پٹریوں پہ بڑھے - گرے - پھر بڑھے
وہ نیچے تھی - ریل اوپر - چھک - چھک - چھک - چھک -

گھریلو صنعت

ج عبدالحمید انڈسٹریل کیمسٹ

پرفیومری کے پوشیدہ راز

آملہ ہیر آئیل

ریفائین تل کا تیل	۴ پونڈ
رس آملہ	۱۲ اونس
خوشبو آملہ	۱ اونس
عطر حنا	۱ ماشہ
روح خس	۱ ماشہ
رنگ سبز	حسب ضرورت

ترکیب ساخت: سب سے پہلے "رس آملہ" حاصل کرلیں۔ اگر سبز آملے دستیاب ہوں تو انہیں لیکر زرد اکوٹ پیس کر نچوڑلیں۔ یہی "رس آملہ" ہے اگر سبز آملہ نہ ملے تو خشک آملہ (جو ہر پنساری سے آپکو بآسانی دستیاب ہوسکتا ہے) چار چھٹانک خرید کر آدھ سیر پانی میں بھگودیں دوسرے دن ایک جوش دیکر زلال حاصل کرلیں یہی "رس آملہ" کی جگہ استعمال کریں۔ جب "رس آملہ" تیار ہوجائے تو ایک صاف قلعی شدہ برتن میں تیل اور آملہ کا رس ملاکر نرم آنچ پر پکائیں جب تمام پانی خشک ہوکر صرف تیل باقی رہ جائے تو اتار کر دوچار دن تیز دھوپ میں رکھدیں تاکہ باقی نمی بھی دور ہوجائے۔ چوتھے دن فلالین کے کپڑے میں چھان کر "آئیل کلر" یعنے تیل میں حل ہونے والا سبز رنگ اسقدر ملائیں کہ تیل کا رنگ گہرا سبز ہوجاوے۔ آخر میں تمام خوشبویات ملاکر ہوابند برتن یا بڑے بوتل میں ایک ہفتہ تک بند رکھیں۔ روزانہ دوچار بار ہلادیا کریں تاکہ خوشبو تیل میں اچھی طرح سرائیت کرجائے۔ ہفتہ بعد ایک ماشہ "مشک پرفیوم" ملاکر شیشوں میں بھرلیں۔

اصلی روغن آملہ" تیار ہوگا۔ جو معطر دماغ ہونے کے علاوہ مقوی دماغ بھی ہوگا۔

بازاری تیلوں کے مقابلہً بہترین مقوی دماغ ہیر تیل تیار ہوگا۔ اگر تجارت کے لئے نہ سہی کم از کم اپنی ضرورت کیلئے بنائیے۔

گیسو بہار تیل

ریفائین ناریل کا تیل ۳ پونڈ۔ آملہ خشک ۲ تولے
ہلیلہ۔ ۲ تولے۔ بلیلہ ۲ تولے
نرکچور ۱ تولہ۔ چھاڑ بانسی ایک تولہ۔ بالچھڑ ایک تولہ
صندل (برادہ) ایک تولہ۔ دھنیا ۲ تولے۔ اگر (برادہ) ایک تولہ
ناگرموتھا ایک تولہ۔ چھڑیلہ ایک تولہ۔ سبز رنگ حسب ضرورت۔
روغن صندل ایک ماشہ۔ جیسمین پرفیوم ۲ ڈرام۔
مشک پرفیوم ایک ڈرام۔ روح خس ایک ماشہ۔

تمام ادویات کو اگر بگرا کوٹ کر تیل میں ملاکر برتن کو اچھی طرح بند کرکے دھوپ میں رکھدیں روزانہ دو ایک مرتبہ ہلادیا کریں" ہفتہ بعد تیل کو نتھار کر جاذب کاغذ" یا فلٹر پیپر میں بذریعہ چھان لیں تیل شفاف (ٹرانسپیرنٹ) ہوجائیگا۔ بعدہ تمام خوشبویات ملاکر بند رکھیں تیسرے دن شیشوں میں بھرلیں نہایت خوشبودار مقوی دماغ اور بالوں کو دراز کرنے والا تیل تیار ہوگا۔

فلمی دنیا کے حالات

از نیوز ایڈیٹر

تحفہ

سیٹھ برادرس پروڈکشن میں تکمیل کے مراحل طے کررہا ہے۔ اس کے ادا آموز آغا جانی کاشمیری ہیں جو کبھی ڈائرکٹر محبوب کے دست راست مانے جاتے تھے۔ چونکہ اب وہ وہاں نہیں ہیں۔ اس لئے اس کمپنی سے آپنے پبلک کیلئے "تحفہ" پیش کیا ہے دیکھیں اس "تحفہ" کو کتنے ممالک پسند کی نگاہ سے قبول کرتے ہیں۔ قیاس تو یہی ہے کہ آپکے ڈائرکشن میں بہت ساری خوبیاں "محبوب" کی سی ملیں گی۔ اور دوسری چیز کہانی خود ڈائرکٹر کے زور قلم کا نتیجہ ہے جس میں نغمے ہیں ولولے ہیں جوش ہے اور جوانی کی بہاریں۔ ان تمام کو اجاگر کرنے کیلئے حیدرآباد کے مشہور و معروف موسیقار ریم۔اے رؤف (عثمانیہ) نے جو ترنم اس فلم میں پیش کئے ہیں وہ پورے ہندوستان و پاکستان میں مقبول ہوں گے۔ اداکاروں کا انتخاب بھی انتہائی دانشمندانہ ہے۔ نواب۔ ویرا۔ انورادھا۔ شاہنواز رحمٰن مصرا وغیرہ۔ حیدرآباد اس فلم کا بڑی شدت سے انتظار کررہا ہے۔

راستہ

ڈائرکٹر حسنین کی طبیعت میں انوکھا پن ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر فلم میں زیادہ سے زیادہ انوکھی چیزیں نظر آتی ہیں۔ آپ کا ہر فلم سماجی اور معاشی لحاظ سے اصلاح کی طرف مائل کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عوام کی اصلاح کی طرف اگر کوئی ڈائرکٹر متوجہ ہوا ہے تو وہ حسنین ہے "راستہ"

ایک انوکھی تصویر ہے جسمیں کم سن بچے اور بچیوں کے لئے اصلاح کا پہلو پیش کیا گیا اور ان کی تربیت کی خامیوں کو نمایاں کیا گیا ہے

رنگین کہانی

اس کے ادا آموز مسٹر انجم حسینی ہیں کہانی واحد قریشی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ موسیقار فیروز نظامی اور اداکاروں میں۔ ارشاد۔ سریکھا۔ دلاری۔ نیاز بیگم محشر شیرازی۔ وغیرہ ہیں۔ اس تصویر کا جو نام ہے۔ کہانی اسی طرح رنگین ہے یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ آج تک فلمی دنیا میں ایسی کہانی پیش نہیں کی گئی۔

مڈل فیل

ڈائرا پکچرز پیش کررہا ہے جس کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کشور شرما موسیقار ہنومان پرشاد ہیں اور اداکاروں میں کرن۔ راجکماری وغیرہ۔ کہانی دلچسپ اور نغمائی ہے دیکھیں اس "مڈل فیل" کے عشق و محبت میں کیا کرتوت ہوتے ہیں ہمیں توقع تو نہیں یہ فلم کامیاب ہوگا۔ کیوں کہ جیسا نام ہے ویسے ہی کیرکٹر بھی ہوں گے۔ اگر اس کمپنی نے فلموں کے نام ایسے ہی رکھے تو پھر آئندہ تانگہ والا۔ شوفر۔ رکشا والا۔ ضرور فلمائے جائیں گے۔

چندر سیکھر

دیو کی بوس پیش کر رہے ہیں۔ فلمی دنیا آپ کی ہدایت کاری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس لئے ایسے مشہور ڈائرکٹر سے ہم فلم کے اچھے ہونے کی ضمانت دیتے ہیں۔ اس فلم میں نغمے زیادہ ہیں اور پلاٹ انتہائی دلچسپ۔ اداکاروں میں۔ اشوک کمار۔ کنن دیوی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

شہزادہ پروڈکشن

شہزادہ افتخار "دینا" کو ختم کر چکے ہیں جس میں دینا اور اشوک کمار خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد وہ "خواب" اور ہندوستان کی تیاری میں منہمک ہیں۔ "خواب" کی تیاری ہونی چاہئے۔ مگر "ہندوستان" کی جبکہ اس کی تاریخ ماحول اور فضا سب کچھ بدل گئی ہے تو کیسے تیار کیا جا رہا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ عوام کو اب تو پرانے ہندوستان کی خواہش نہیں وہ نئے ہندوستان کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شہزادہ موصوف "ہندوستان" کی تیاری کے وقت ضرور سوچیں گے۔

فلم انڈیا

یہ ایک ماہنامہ فلمی رسالہ ہے جو پورے ہندوستان میں اپنی فلمی پالیسی کی بناء پر مقبول ہو چکا ہے مگر ماہ جون کے شمارہ میں اسکی پالیسی میں وہ بات نہیں رہی۔ "گاندھی جی کے چرنوں میں ایک مسلمان دیہاتی لڑکی کو گرایا گیا ہے" اور ایسے متعدد واقعات تصویر کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں مسلمانوں کیلئے یہ حرکت بڑی دل آزار ہے اور اس سے پرچہ کی پالیسی پر اثر پڑنا چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر بابو راؤ پٹیل اپنے اخبار کے وقار کو سیاسی بحران میں غرق نہ کریں گے۔

حامد حیدرآبادی نغمہ نگار "قسمت فلم"

فلمی دنیا کی سیر

(قسط اول)

میرا مطلب ہے فلمی دنیا کی بر پردہ رعنائیوں سے تو آپ بخوبی واقف ہیں مگر در پردہ سیاکاریاں! کاش آپ جان سکتے۔ فلمی دنیا کا ایک رخ جتنا دیدہ زیب ہے۔ دوسرا اتنا ہی بھیانک۔ آپ یقین نہ کریں گے۔ آئیے میں آپکو فلمی دنیا کی سیر کراؤں۔ سیر کرنے کیلئے پہلی شرط تو یہ ہو کہ اپنی شرافت۔ اخلاق۔ نیک نیتی خاندانی بزرگی۔ قابلیت کی ڈگریاں اور اسناد سب کو کوئی صحن میں دفن کر دیجئے آپ کہیں گے واہ۔ ارے صاحب مثل مشہور ہے جیسا دیس ویسا بھیس۔ وہاں ان چیزوں کی کوئی قدر نہیں۔ آپ برا نہ مانیں تو میں یہ عرض کرنیکی جرات کروں گا کہ والد بزرگوار کا اسم شریف بھی یاد نہ آئے تو اچھا ہے۔ اس وجہ سے کہ یہاں کوئی جناب کا حسب نسب پوچھنے کی گستاخی نہ کرے گا۔ دوسری شرط یہ ہے جتنی رقم ساتھ ہے اتنا ہی اچھا ہے۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ آپ والدہ محترمہ کے زیور چرا کر فروخت کر ڈالیں یا والد محترم کی تجوری پر ڈاکہ ڈالیں۔ آپ مجھ پسند کیجئے حالات بھی کچھ ایسے ہی پیش ہوں گے۔ مانتا ہوں کہ جناب پریم لبھ

چاہیئے ہیں۔ سہگل کی طرح آپ کی بھی چال متوالی ہے۔ خواہ وہ در پردہ لنگڑا ہی کیوں نہ ہو۔

سہگل کی طرح آپ کی آواز میں بھی درد ہے۔ یعقوب اور موتی کی طرح آپ بھی فطری اداکاری کر سکتے ہیں۔ مگر حضور فلمی دنیا میں موقع حاصل کرنا۔ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔ کوشش پیہم میں دن گزر جائیں گے۔ مہینے گزر جائیں گے سالوں تک نوبت پہنچ جائے گی۔ یہاں تک جتنی رقم آپ ساتھ لے آئیں گے ختم ہو جائے گی۔ دوست احباب کا سہارا ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ بھی کب ساتھ دیں گے۔

اور پھر۔ اور پھر........ پھر کیا ہوگا غور سے سنئے۔ چنے کھانے پڑیں گے۔ سگریٹ سڑک چھاپ پینی پڑے گی۔ کہیں پناہ نہ ملے گی تو فٹ پاتھ پر سونا پڑے گا۔

فٹ پاتھ کی اہمیت سے شاید آپ واقف نہ ہوں مگر یہ واقعہ ہے کہ آج جو فلمی ستارے میرین ڈرائیو کی چھ منزلہ پر گھر کو جنت بنائے ہوئے ہیں وہ سب کے سب سوتے جاگتے اسی فٹ پاتھ پر راتیں کاٹ چکے ہیں۔ فٹ پاتھ کتنا بلند مقام ہے یہ کچھ ان ہی کے دل سے پوچھئے۔ بھلا آپ خدانخواستہ ایسی تکلیفیں کیوں اٹھانے لگے۔

توبہ ہے میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ آپ اصرار کر رہے ہیں اور میں ٹالتا جا رہا ہوں۔ مگر آپ ایسے تھوڑے ہی مانیں گے۔ آیئے میرے ساتھ۔

بمبئی میں ایسی ویسی کمپنیاں تو سینکڑوں ہیں۔ جس گلی میں نکل جایئے انشاءاللہ دو چار سائن بورڈ نظر آ ہی جائیں گے۔ یہ نہ پوچھئے ان کے مالک فلم کمپنی کا آفس کھولنے سے پہلے کیا پیشہ کرتے تھے یہ راز کی بات ہے۔ آپ کو میں یہاں کی سب سے بڑی کمپنی میں لیجانا چاہتا ہوں۔ دیکھئے وہ۔ ذرا سنبھل جایئے۔ ع

یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانہ کہتے ہیں

بات یہ ہے کہ گیٹ پر خان لوگ کھڑے ہیں۔ یہ بڑے گستاخ ہوتے ہیں اچھے برے کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ نہ کھادی کا کرتہ دیکھتے ہیں اور نہ ٹویڈ کا سوٹ۔ بس پتھر مار دیتے ہیں۔ کدھر جائے گا تم کس سے ملے گا۔ بھلا بتایئے نیا آدمی کیا جواب دے۔ ابھی آپ کچھ ارشاد فرما ہی رہے تھے۔ پھر انہوں نے آنکھیں نکال کر کہا "جاؤ جاؤ" اب آپکو دنیا کی کوئی طاقت اندر داخل نہیں کر سکتی۔ اور آپ ہتک نبھانے کیلئے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے سیٹی بجاتے الٹے پاؤں لوٹ آئیں گے۔ مگر ٹھہریئے میں آپ کو ترکیب بتاؤں۔ پہلے تو یہ کہ آپ ٹیکسی کر لیجئے۔ کم سے کم کمپنی کے قریب آ کر ہی۔ موٹر دیکھ کر یہ لوگ ذرا مرعوب ہو جاتے ہیں۔

دوسری کم خرچ ترکیب یہ ہے کہ ان کے سوال کے جواب میں فوراً بول جایئے کہ "ہم فلاں سے ملیگا" میرا مطلب ہے کمپنی کے ڈائرکٹر صاحب کے نام سے تو آپ واقف ہوتے ہی ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شیروانی پہنکر کبھی نہ آیئے شیروانی سے خان لوگ اور بھی بھڑک اٹھتے ہیں سوٹ چونکہ حاکموں کا لباس ہے اسلئے وہ ہی بہتر ہے۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ فرض کیجئے آپ اندر داخل ہو گئے اور پھر رہے ہیں ڈائرکٹر صاحب کی تلاش میں۔ ایکٹر بننے کے خواہشمندوں کو ڈائرکٹر ہی کی تلاش ہوتی ہے۔ ہاں تو آپ حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ اس سے پوچھو اس سے پوچھو کوئی پتہ نہ دے گا بلکہ آپکی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھے گا کوئی نہ کوئی بھلا آدمی نکل ہی آئے گا جو آپ کو ڈائرکٹر صاحب کے آفس کا پتہ دیگا۔

آپ پہونچے۔ آفس والے نے آپ کا استقبال کیا یعنی آپ کو اندر جانے سے روک کر ایک چھوٹی سی کاپی آپ کے ہاتھ میں دیدی۔ اسمیں دو خانے اہم ہوتے ہیں ایک میں تو آپکو اپنا نام لکھنا ہوگا۔ دوسرے میں کام۔ اس خانہ پری کے بعد لوائے آپکو بازو پڑے ہوئے صوفہ

تشریف رکھنے کا اشارہ کرکے آفس کا دروازہ نہایت احتیاط سے کھولیگا۔ اور پھر فوراً ہی بند کرکے اپنا یونیفارم ٹھیک کرنے لگے گا۔ کچھ دیر توقف کے بعد چلا جائے گا۔ پھر واپس بھی آجائے گا۔ آپ اپنے اطمینان کے لئے اُس سے پوچھ لیجئے کہ اس نے چٹھی دیدی کہ نہیں۔ وہ کہیگا ہاں بیٹھو نا بس آپ بیٹھے ہیں۔ نرم نرم صوفے بھرآپ ہیں۔ آپ کی صنف کے لوگ جتنے آئیں گے سب تشریف فرما ہوتے رہیں گے۔ پھر دوسری صنف آتی رہے گی اور باریاب ہوتی رہے گی۔ آپ پہلو سے پہلو بدل سکتے ہیں۔ سگریٹ پر سگریٹ جلا سکتے ہیں۔ سامنے لگی ہوئی تصویروں کو گھور سکتے ہیں۔ آنے جانے والی ہستیوں کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کو اس قسم کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اگر یوں وقت آسانی سے نہ کٹے تو آفس کی طرف کان لگا دیجئے۔ نقرئی قہقہے۔ دبی دبی چیخیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں۔ آواز سے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ کہ کوئی بگڑا پھر کسی نے منایا۔ کوئی جانے کیلئے اُٹھا، اور کسی نے ہاتھ کھینچ کر پھر بٹھا دیا۔ کبھی بھاؤ تاؤ بتائے جائیں گے۔ معاملہ کی بات چیت ہوگی وہ اسطرح کہ "میں تو اس سے کم نہ لوں گی۔ بلیک کا اتنا پھر وہائٹ کا اتنا۔ اڈوانس اتنا ہوگا۔ انکم ٹیکس کمپنی دیگی۔ لنچ اور آنے جانے کیلئے موٹریں آپ ہی کے ذمہ" وغیرہ وغیرہ

بھلا ایسے میں آپ کی کون پرواہ کریگا۔ آپ کے صبر کی انتہا ہوجائے گی۔ آپ کا ظرف اُبل پڑیگا اور آپ صوفہ چھوڑ کر ایسے اُٹھ کھڑے ہوں گے جیسے آپکو کانٹے ہی تو چبھ رہے تھے۔ مگر واپس لوٹنے کا ارادہ نہ کیجئے۔ کم سے کم چہل قدمی فرماتے رہئے۔ اتنے میں بوائے کو بلانیوالی گھنٹی بجے گی بوائے چلا جائے گا۔ آپ کے جاتے ہوئے اُسے جھجک محسوس نہ ہوگی۔

آپ کے کان کھڑے ہوگئے۔ آپ نے ٹائی درست کی بال سنوارے۔ کھنکار کے آواز صاف کی اتنے میں بوائے آگیا

"جناب کل آنا منگتا" سنا آپ نے "جناب کل آنا منگتا" آپکو یقیناً تاؤ آئے گا۔ آپ کی رگِ حمیت بھڑک اُٹھے گی۔ آپ جی ہی جی میں بڑبڑانے لگیں گے "عجیب بدتمیز ہے۔ نہ ملنا تھا تو اتنی دیر بٹھا دینے کے کیا معنی"؟

بندہ پرور آپکی طبیعت کے خلاف ناسلوک کیا گیا۔ آپ کا غصہ سر آنکھوں پر مگر یہ فلمی دُنیا ہے وہ دنیا نہیں جہاں سے آپ تشریف لارہے ہیں۔ سب کچھ بھول جایئے۔ اور صرف یہ یاد رکھیے کہ "جناب کل آنا منگتا ہے"

دوسرے دن پھر بن سنور پہنچ جایئے۔ حسب معمول آپ گیٹ پر رُک جائیں گے۔ آپ کہیں گے "ڈائرکٹر صاحب نے بلایا ہے" آپکو معلوم ہے کیا جواب ملے گا "ارے بابا آج نتیجہ ہے کوئی بھی نہیں ملے گا" آپ حیران ہوجائیں گے کل اتوار ہے کل تو تعطیل ہوسکتی ہے۔ مگر آج کوئی بھی نہیں ملیگا کیا بات۔

ارے صاحب بات یہ ہے کہ سنیچر کا دن فلمی دنیا میں بڑا تاریخی دن ہوا کرتا ہے۔ بارش کے موسم کو چھوڑ کر اس دن تو ہزاروں کے وارے نیارے ہوتے ہیں۔ کتنے محتاج غنی ہوجاتے ہیں اور کتنے ہی غنی محتاج۔ صاف صاف کہدوں یہ ریس کا دن ہوا کرتا ہے۔ فلمی دنیا والے ریس کھیلنا اپنا اولین فریضہ سمجھتے ہیں اگر وہ نہ کھیلیں تو برادری سے خارج ہونیکا خوف دامنگیر ہوجاتا ہے اسلئے آفس بوائے سے لیکر پروڈیوسر تک اور اکسٹرا سے لیکر فلم اسٹار تک اسمیں یکساں شریک ہوتے ہیں۔ کوئی کم کھیلتا ہے کوئی زیادہ۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے اسلئے پیر کے دن پر انحصار رکھیے۔

زیادہ تفصیل طوالت کا باعث بن جائیگی۔ اسلئے مختصراً عرض ہے کہ اسطرح دن گزرتے جائیں گے۔ کبھی سنیچر ہوگا کبھی اتوار۔ کبھی شوٹنگ ہوگی کبھی ریہرسل۔ کبھی وہ بلیرڈ کھیل رہے ہوں گے کبھی تاش۔ کبھی لنچ ٹائم ہوگا کبھی ٹی ٹائم کبھی مصروف ہوں گے کبھی آرام فرمارہے ہوں گے۔

لیکن یا تو وہ آئیں گے ہی نہیں یا جب آپ پہنچیں گے تو وہ جا چکے ہوں گے۔

دنوں سے مہینوں پر نوبت آ گئی۔ فلم کمپنی کے چکر کاٹتے کاٹتے آپ کی کیا حالت ہو جائیگی آپ ہی غور فرمائیے۔ کتنی ہی بار جوتا سلوایا جائے گا پھر وہ ہے کہ محض پھاڑا ہی چلا جائے گا۔ سوٹ ارجنٹ بار بار دھلے گا پھر کوٹ کا کالر پتلونوں کے پائنچے پھٹ پڑھیں گے۔ ٹائی کی روزانہ استری کروائی جائے گی پھر وہ اپنا رنگ بدل دے گی پانچ روپئے روز والی ہوٹل تو آپ کب کی چھوڑ دیں گے بلکہ ایک روپیہ روز کی پلنگرائی بھی بار معلوم ہو گی رلیسٹورنٹ سے منہ پھیر کر آپ بھٹیار خانے تلاش کرتے پھر تیں گے۔ سگریٹ کی حد تک اطمینان رکھئے "چار مینار" بہ آسانی مل سکتی ہے۔

اس نوبت پر بھی استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے آپ جن ڈائرکٹر صاحب سے ملنے جایا کرتے ہیں وہ تو سمجھئے کہ ایک حد تک شریف آدمی ہیں۔ کیوں کہ انہوں نے ملنے سے انکار تو نہیں کیا یہہ اور بات ہے کہ آپ کی ملاقات ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتی۔ ورنہ ایسے بھی ڈائرکٹر صاحبان ہیں جو کسی کو ملاقات کا شرف بخشنا اپنی توہین سمجھتے ہیں خیر!

خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا جبکہ آپ کو شرف باریابی حاصل ہو رہا ہے۔ جیسے ہی آپ آفس میں داخل ہوئے انہوں نے نیچے سے اوپر تک گھورنا شروع کیا۔ آپ فرشی سلام کئے جا رہے ہیں بعد وہ آپ کے جلووں میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے ہیں کہ آپ کو اپنے آپ پر شبہ ہونے لگے گا۔ ابھی آپ کچھ ارشاد فرمانے والے ہوں گے کہ انہوں نے پہلے ہی ارشاد فرمادیا "فی الحال ہمارے پاس کوئی کام نہیں"۔

آپ اپنے متعلق کچھ کہنے بھی نہ پائیں گے کہ دوبارہ وہی الفاظ آپ کے کانوں میں گونجنے لگیں گے۔ سوائے لوٹ جانے کے اب تو کوئی چارہ نہ ہوگا۔

اگر خوش قسمتی سے آپ کے پاس کوئی سفارشی خط بھی ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ آپکو مینجر صاحب کو پتہ لکھا دیجئے کا حکم ہوگا۔ آپ دل ہی دل میں خوش ہوں گے مینجر صاحب کو پتہ لکھوا دینے کے بعد جو لازمی طور پر آپ کے گھر کا پتہ ہوگا وہ فرمائیں گے "جب کام شروع ہوگا ہم آپ کو اطلاع کریں گے"۔

آپ خوش خوش واپس ہوں گے راستے میں جانے دنیا کی فضا میں آپ کتنے محل بنائیں گے پھر مسمار کر ڈالیں گھر پہنچنے کے بعد ڈاک کا انتظار آپ کی قسمت میں لکھ دیا گیا۔

بس انتظار کیجئے پھر کرتے جایئے۔ آخر تھک کر آپ خود اپنے کئے پر پشیمان ہو جائیں گے۔ پھر فلمی دنیا پر لعنت بھیج کر خاموش ہو رہیں گے۔

آیندہ صحبت میں آپکو بتاؤں گا کہ اگر خوش قسمتی سے آپکو فلمی دنیا میں موقع مل گیا تو کیا ہوگا؟ ———

مشہور سیاسی رسالہ نئی زندگی کا
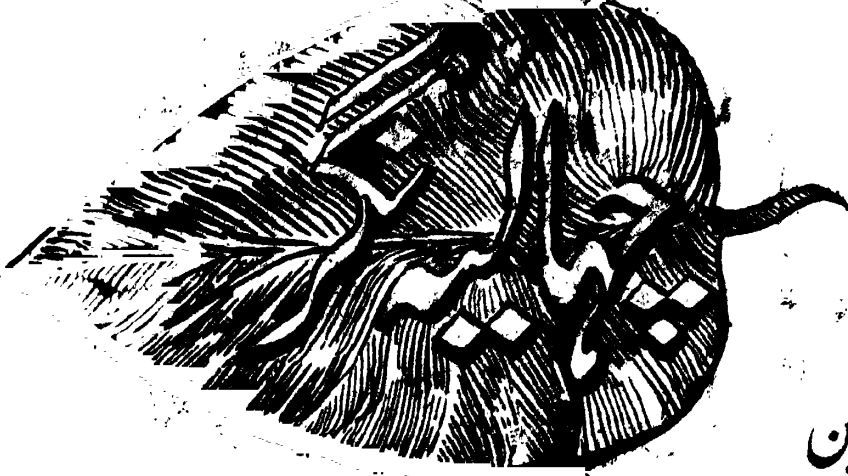
چھالیہ نگر
پان کے شائقین
چاہتے ہیں کہ پان کا ہر ایک لوازمہ دلپسند رہے ۔ اسی خیال کا لحاظ
آپ ”چھالیہ نگر“ میں پائیں گے
جہاں
سپاری ۔ الائچی ۔ کتھ ۔ جوز ۔ جوتری اور چکنی سپاری و زردے وغیرہ
ایک سے ایک لاجواب ملتے ہیں اور لطف یہ کہ بازار سے ارزاں داموں
فروخت کئے جاتے ہیں
پان کو خوش ذائقہ بنانا مقصود ہو تو براہ کرم ہمارے ہاں تشریف لائیے ۔ جہاں آپ کے
داموں کا صحیح بدل ملیگا ۔ (نوٹ): ۔ مخفی مباد کہ لفظ ”چھالیہ نگر“ اور ”پان“ آل انڈیا رجسٹرڈ ہو رہے ہیں۔
منیجر ”چھالیہ نگر“
معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد دکن
پروپرائٹر ایم ۔ اے ۔ خان

گشتِ

مسٹر خواہ مخواہ کے قلم سے

ہندو مسلم ایک ہو

یہ ایک روزنامہ اخبار کا مستقل عنوان ہے اور اس پر بڑے اچھے انداز سے ہندو اور مسلمان کے گلے ملائے جاتے ہیں۔ اور اسی کے نیچے "شیش محل" کی سرخی ہے جس میں کبھی ہندو کی دھجیاں اُڑائی جاتی ہیں تو کبھی مسلمان کے پرخچے کردئے جاتے ہیں۔ بہرکیف یہ عنوان علیٰحدہ علیٰحدہ قلموں کے ہیں اسلئے ہمیں اس کی پالیسی کے سوچنے میں دقت نہیں ہوتی کیوں کہ ایک تخت کے اگر دو راجہ ہوں تو پھر تخت کا خدا ہی حافظ۔ لیکن اس مثال سے آپ یہ نہ سمجھ جائیگا کہ اخبار بہت جلد بند ہو جائے گا اجی صاحب ابھی تو ایڈیٹر صاحب کا خرچ ہی خرچ ہے آمدنی کا دروازہ بند

ایک سرخی اسی طرز کی نظر سے گذری کہ "گوشت کا قضیہ ختم ہو گیا اب روپیہ میں تین پاؤ ملا کرے گا۔ اگر قصاب زیادہ پیسے مانگے تو قریب کے تھانہ میں خبر کردیجئے تاکہ وہ کارروائی ضابطہ کریں" اسی کے نیچے یہ خبر بھی شائع ہوئی ہے کہ "جب ہم اس قصاب کی شکایت لیکر تھانہ پہونچے تو پولیس کے آفیسر نے یہ جواب دیا کہ اس معاملہ میں دست اندازی کرنے کیلئے ہمارے پاس کوئی احکام نہیں پہونچے ہیں"۔ بتائیے اب اس اندھیر نگری کو دنیا کہیں یا دوزخ۔ بہرکیف زندگی گذارنا ہے۔ تو یہ دوعملی ضرور کرنی ہی ہوگی۔ یہ دوعملی کا لفظ عام ہوگیا ہے۔ آپ سرکار عالی کے محکموں سے لیکر خانگی اداروں، قیاسی جماعتوں میں بھی پائیں گے۔ جب دوعملی کا دور دورہ شروع ہی ہو گیا ہے تو گشت میں بھی آپ اس متبرک لفظ کا تبرک ضرور پائیں گے۔

خون کا آخری قطرہ

ایک ایسی انجمن کی جانب سے شائع ہوا ہے جس کے پاس نہ خون ہے نہ محبت نہ ایثار۔ میں ہمیشہ کہتا آیا ہوں کہ یہ لوگ قیامت تک سوتے رہیں گے اور انہیں بیدار کرنے کے لئے کوئی حربہ کارگر نہ ہوگا غریب خون دے سکتا ہے۔ غریب قربانی دے سکتا ہے۔ غریب ایثار اور محبت کا تحفہ پیش کرسکتا ہے تم لوگ ہوائی محل سے اپنی محبت کا جام صحت تجویز کرتے ہو۔ تم لوگ اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرسکتے ہو تم لوگ رُخ کے طلبگار رہتے ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ جس شخص نے خون ہی دیکھا ہو وہ خون کا آخری قطرہ کیا پیش کرسکے گا؟ بڑا اچھا اقدام ہے لیکن مجھے سوائے بزدلی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ تھی میری اخباری گشت اور آج اخباروں میں جتنا مواد مل رہا ہے وہ کہیں میسر نہیں۔ کوشش کررہا ہوں کہ گشت کیلئے مواد حاصل کروں مگر ہندوستان کی آزادی نے میری گشت کو بھی دراز ہونے سے روک دیا۔ ہر شخص کا رجحان مستقبل کے نتیجہ کا طلبگار ہے اور ہر شخص

ست کو چھوڑ کر اخباروں کی خبروں پر نگاہیں جمائے ہوئے
ے۔ دیکھیں ۱۵ اگسٹ کب آتا ہے اور کب ہندوستان کی
زادی کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن جب آزادی کا لفظ آ ہی گیا
پھر یہ بھی چلتے چلتے پوچھ لینا ضروری ہے کہ ہندوستان کے
رنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن کیوں؟ "فوراً چلے جاؤ" کا نعرہ
گانے والے اب ایسے کیسے مہربان ہوگئے۔ آپکی دریا دلی کے
لیا کہنے لیکن عوام کا خیال ہے کہ اس موزوں جگہ پر کوئی ہستی
یسی نہیں ہے جو یہ بارِ عظیم اپنے کندھوں پر اٹھا سکے۔
در ویسے بھی ہندوستانی انگریز کی غلامی کو ہندوستانیوں کی غلامی
سے بدرجہا بہتر سمجھتا ہے۔

اچھا یہ تو بتائیے کہ چرخہ کے بجائے اب اشوک کی لاٹ
یوں رکھی جا رہی ہے چرخہ حرکت کر سکتا تھا اور حرکت میں
برکت بھی ہوتی مگر یہ "لاٹ" ت کیا ہوگا جب "لاٹ" رکھنا
قرار پا گیا تو اس لاٹ سے اچھی "لاٹ" تو دہلی ہی میں ہے
وہ بہت بہتر ہو سکتی ہے پھر اپنی اپنی مرضی۔ ہاں یہ تو کہنا
بھول ہی گیا کہ مارشل اسٹالن نے ابھی تک ہمارے ہاں انکے
سفیر کو بلانے کی خواہش نہیں کی اور ہم ہیں کہ پورے لیس ہوکر
مع چرخہ کے "ماسکو" جا رہے ہیں آخر "ماسکو" میں دھرا
کیا ہے اور بغیر تمنا کے "مان نہ مان میں تیرا مہمان" اچھا نہیں
ویسے بھی آپ کے دماغ اعلیٰ ہیں اسلئے آپ کی سیاست کو ہم
کہاں پہونچ سکیں گے۔ لیکن عوام کا خیال ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ء
کی سیاست کے بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس گئے اور ایسے
پھنسے کہ پھر نکلنے اور پر آنے کیلئے ایک عرصہ چاہئے۔ خیر کچھ
بھی ہو میں تو آپ کی سیاست کا مدح خواں ہوں۔ کیونکہ
ایک فائدے میں اور دوسرا نقصان میں۔ نیت ڈانواں ڈول
ہو تو پھر نتیجہ بھی بُرا ہے۔

عوام کا خیال ہے کہ پھر زمانہ پیچھے کی طرف جا رہا ہے
ہمارے سامنے اب وہ تمام نقشے موجود ہیں جو ابتدائے آفرینش
میں تھے یعنی یوں سمجھئے کہ قیامت قریب ہے۔

تنگبھدرا

اس ندی کے کنارے ایک آبادی ہے جہاں
کے مسلمان مذہب کے انتہائی پابند تھے اور اسی طرح ہندو
بھی۔ یہاں مساجد ہیں درگاہ ہیں اور لاجواب منادر بھی
اور تاریخ گواہ ہے کہ "رام اور سیتا" اپنے بن باسی کے
زمانے میں یہاں سے گذرے۔ خیر اسوقت یہ رنگ نہیں ہے
اب ایسے بزرگوں کی جگہ پر انکی اولاد ہے جو مغربی اخلاق
سے تھوڑی بہت متاثر ضرور ہے۔ وہاں کا ایک واقعہ بڑا
دلچسپ ہے۔ شب معراج میں مسجد گیا فرض نماز ادا ہونے کے بعد
ابھی سنت رکعتیں ختم نہ ہوئیں تھیں کہ ایک منحنی نوجوان
ممبر پر بغیر کسی اطلاع کے کھڑے ہوگئے۔ اور تقریر فرمانے لگے
کبھی تاریخ کی بہادری کے کارنامے بتائے تو کبھی ٹیپو رحمۃ کے
واقعات دہرائے۔ مطلب یہ تھا کہ مسلمان بہادر رہے اور
بہادری اس کا شیوہ۔ زمانہ کا رنگ دیکھتے ہوئے اور خود کا
خیال فرماتے ہوئے حفظ ما تقدم کیلئے آلات حربی کو خریدنے
کی تلقین فرمائی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتے رہے کہ اگر
تم یہ بھی خریدنے کے اہل نہیں ہو تو اپنے اسلاف کے "چکنے
لٹھ" رکھو" شائد غلطی سے نکل گیا ہو یا خود موصوف کے
پاس ایسے لٹھ ہوں گے جو ان کے اسلاف کے آڑے وقت
چکنے پن کا جوہر دکھا چکے ہوں۔ یعنی مار لگے اور چکنا ہٹ
سے پھر پھسل جائے مطلب یہ کہ نہ لکڑی ٹوٹے اور نہ سانپ مرے
چونکہ آپ کے گلے میں درد ہے اور پھر بلغمی جسم ہے اسلئے جب
آپ للکار کر اظہار خیال فرماتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
کوئی عین "وقت" پر آپکا گلا دبا رہا ہے یہ پیر نابالغ ہیں
اور اس آبادی میں آپ اپنے وجود کو انتہائی مفید بتلاتے ہیں
لیکن آبادی کا نوجوان طبقہ آپکو "دخل در معقولات" کا
سین بورڈ کہتا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ کام کر رہے ہیں۔ اور
کرتے جائیے ممکن ہے آپکو بھی کوئی موقع ملجائے جسکا

اوروں کو مل رہا ہے۔ پوری تقریر آپکی نامکمل تھی جو کچھ بیان کرتے تھے اُس کے سمجھانے کی اپنے میں صلاحیت نھیں رکھتے تھے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس فن کے آپ ماہر نہیں۔ منھ بند رہنے سے کھُلا رہنا ہی اچھا ہے۔ آپ کی تقریر کے ختم ہونے پر دوسرے نوجوان نے تقریر کی آپکی تقریر میں اس وجہ سے لُطف نہ آیا کہ اس مسجد میں جتنے بیٹھے تھے وہ سب ان کے بڑوں کے ملنے والوں میں سے تھے اور یہ لوگ آپکا بچپن بھی دیکھ چکے تھے پھر آپ کے کہنے کا کیا اثر ہوسکتا تھا۔ مگر پہلے مقرر نے جو تشنگی باقی رکھی تھی اس کو آپ نے مکمل کر دیا اور اسطرح یہ تقریر بھی جاری تھی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا میں وہاں سے جاچکا تھا۔ میرے جلد از جلد جانے کا مقصد یہی تھا کہ دوسرے صاحب جو تقریر فرما رہے تھے ان کے سر پر کشتی نما ٹوپی تھی جو شیر کے چمڑے سے بنائی گئی تھی جب کبھی میری نگاہ اُٹھتی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی اور اللہ کے گھر میں سوائے عبادت کے ہنسا "چکنے لٹھ" اور غیر موزوں الفاظ میں تقریر کرنا سب منع ہے۔ اسلئے میں نے گھر آکر فرائض مذہبی ادا کئے۔

دکن میں بوئے گل پھیلی ہے میری کلو...
کیف وشباب کی مستی بھری دنیا میں
جہاں حسن کی تعریف ہوتی ہے وہاں ان
"عطریات" کا تذکرہ بھی رہتا ہے۔
ممکن ہے کہ آپ اسکی آزمائش نہ کیے ہوں ؟
پتہ یاد رکھیے
خوشبو محل
معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد دکن

اس کارخانہ کی ہر چیز ایسی ہے
جس نے قلیل مدت میں
جو مقبولیت حاصل کی ہے
وہ ہمارے نادر الوجود
ہیں جن کے استعمال کے بعد آپ بھی
فخر محسوس کریں گے
کارخانہ قوامِ نظامی رجسٹرڈ
عمدہ بازار
حیدرآباد دکن
NIZAMI
TOOTH POWDER
RED

محکمہ دار التجربہ

سرکار عالی

گلبہار ہیئر آئل کا نمونہ
جو معائنہ کیلئے پیش کیا گیا
ہے۔ امتحان سے معلوم
ہوا۔ کہ وہ اصلی سبزی
تیل ہے اور مادی چیزوں
کی آمیزش سے
پاک ہے اور رنگ
خوش نما اور خوشبو
نہایت لطیف ہے۔

گلبہار کمپنی افضل گنج روڈ حیدرآباد دکن